رہنمائے انسانیت

یعنی

دین فطرت

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ

بیشک اس میں اُن لوگوں کے لئے جو اپنی فطری حیثیت، بندگئ حق پر قائم رہنا چاہتے ہیں، دل میں اثر کرنے والی باتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فطرت کے تقاضے

دینِ فطرت یا دینِ حق

عرفانِ مروجہ پر ایک نظر

مُرتّبہ

صفوۃ الرحمٰن صابر مدیر "الحق"

هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ

خالق فطرت کو نہ پہچاننا ، اپنی فطرت کو نہ پہچاننا ہے

انجام حیات سے جاہل رہنا ہے ۔ موت ' اختتام حیات نہیں

ابدی حیات کا آغاز ہے ۔ جاہل انسان اپنی زندگی کو بامراد

نہیں بنا سکتا ۔ علم حق کی روشنی کے بغیر جہل کی ظلمت دور

نہیں ہو سکتی ۔ خدا شناسی ، فطرت شناسی ، عاقبت

بینی ، یہی عقل و انسانیت ہے ۔۔



فہرست

۱ ۔ مقصدِ کتاب (فطرت سے انحراف کے اسباب)...... ۵

۲ ۔ اشاعتِ دین و تجدید ایمان کے قرآنی اصول...... ۸

۳ ۔ احوال واقعی (واحد فطری مرکز کی تلاش)...... ۱۲

۴ ۔ محمد رسول اللہ (معلم فطرت)............ ۱۹

۵ ۔ قرآن کا تعارف (صحیفۂ فطرت).......... ۲۳

۶ ۔ دین فطرت و سیاست............ ۲۶

۷ ۔ مسلم کا قرآنی مفہوم............ ۳۶

۸ ۔ الہٰی تعلیمات میں باطل افکار کی آمیزش...... ۴۳

۹ ۔ دین فطرت (دین حق)............ ۵۹

مرض کے ماہر ہی سے مرض کا علاج ضروری ہے چاہے
وہ کسی ملک و قوم کا انسان ہو۔ امراضِ قلبی کے علاج کا بھی
یہی خدائی قانون ہے۔ عقل و فطرت کا یہی فیصلہ ہے۔۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ

(مطلب) انسانوں کی فطرت اللہ نے بنائی ہے اس میں کوئی تغیر و تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

مقصدِ کتاب

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے
ابھی محفل میں شاید ہے کوئی دردآشنا باقی (اقبالؒ)

دین حق کے جمال جہاں آراء کا رنگ اس قدر بے رنگ کر دیا گیا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دین کو "اساطیر الاولین" (پرانی کہانیاں) سمجھا جاتا ہے تو غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں خاندانی رسوم و رواج، روایات کا نام دین ہے، بصیرت دینی کا ماتم کیجئے کہ ہمسایہ، حکمران اقوام کی جاہلانہ رسوم اور اسلاف کے یادگاری طریقوں کو اختیار کر کے ان کو اسلامی تقاریب میں شمار کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر وہ بے دینی اور خلاف شرع معاملات و کاروبار، حکومت جو مسلمانوں کے ہاتھ سے انجام پائے اسلامی سمجھی جاتی ہے۔ قوم و نسل و وطن کے پرستاروں سے جو بصیرت حاصل کیجائیگی اس کو حقیقت سے دور کی نسبت بھی نہیں ہوسکتی، جس خاکی کا فریضۂ حیات نوری ہوکر دوسروں کو نورانی بنانا تھا، وہ جمالِ ہم نشین کے اثر سے ناری ہوا جارہا ہے

غرض زندگی کے تمام مسائل میں ایک غلط طرز خیال اور غیر صحیح طریقۂ فکر، استادانِ مغرب اور ان کے شاگردوں کے دماغوں پر چھایا ہوا ہے، اس سے مرعوبیت اور اسلام سے ناواقفیت نے دل و دماغ میں عجیب الجھن و انتشار پیدا کر رکھی ہے، اور دین میں باطل افکار و کردار کا بہت انضمام ہوتا جارہا ہے، دین کی غلط تعلیمات کی وجہ سے حق و باطل کا امتیاز ہی باقی نہ رہا۔ حتیٰ کہ غیر اقوام کے مفکرین بھی حق و باطل کو ایک سمجھے ہوئے ہیں۔

بعض اچھی صلاحیت والوں کو دیکھا گیا ہے کہ قرآن و سنّت کی سادہ و فطری تعلیم، دین و کمالِ دین سے صرف اس غلط فہمی میں محروم ہیں کہ تصوّف حاصل کئے بغیر انسان دین و کمالِ دین پر فائز نہیں ہوسکتا، اور تصوف میں بڑا حصّہ عجمی، غیر قرآنی مسائل کا داخل ہوگیا ہے اور ان کو اسرار قرب کہا جاتا ہے بر بنائے شہرت جن حضرات کے صاحب اسرار ہونے کا انہیں علم ہوتا ہے وہ حضرات اس قدر پیچیدہ اور فلسفیانہ، منطقیانہ مباحث میں الجھا دیتے ہیں کہ عقلِ سلیم ان مسائل پر ایمان لانے سے روکتی ہے لیکن حسن ظن اس قدر غالب ہوتا ہے کہ تصوّف کے غیر قرآنی مسائل پر تنقید کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور خود اپنے ہی سے بدگمان ہوکر وہ سمجھتے ہیں، کہ اس گنجان وادی میں چلنے کی اہلیت ہم میں نہیں ہے، حالانکہ دین یا کمالِ دین کی قرآنی تعلیمات میں نہ ایسا الجھاؤ و پیچیدگی ہے اور نہ ایسے غوامض ہیں جن کی وجہ سے انسان کسی گمراہی میں پڑ سکتا ہے دین اسلام بالکل فطری مذہب ہے جو نہایت آسان اور عام فہم ہے، بعض اہل حق بزرگانِ دین نے کمالِ دین کی تعلیم کو اس لئے پوشیدہ رکھا اور اس کو اسرار میں داخل کیا کہ مقامِ قرب کے آداب کو ملحوظ رکھنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں، انسان جب تک دین کے ابتدائی تمام مراحل کماحقہٗ طے نہ کرے اور اطاعت و انقیاد

بندگیٔ حق کے حقیقی مقام پر فائز نہ ہو جائے، مقام قرب کے آداب کو ملحوظ رکھنا اس کے لئے دشوار ہوتا ہے اور اس مقام کی بے ادبیاں غیر شعوری طور سے حبط اعمال کا سبب ہو جاتی ہیں، اس لئے بعض بزرگانِ دین اس کو کافی حد تک چھپاتے تھے۔ ان کے اس استتار کے یہ معنی لیے گئے کہ یہ علوم عوام کی فہم سے بالا ہیں، اور اس کے ظاہر کرنے میں گمراہی پھیلتی ہے جو کسی طرح صحیح نہیں، گمراہی کا اصلی سبب تو قرآنی حقائق کی غیر صحیح تعلیمات اور کشف و الہام کی غیر قرآنی تعبیرات ہیں۔ جس کی وجہ سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر اقوام کے طالبِ حق افراد بھی اسلام کے متعلق بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ان تمام غلطیوں کا ازالہ اور تمام بنی آدم کے لئے واحد دینِ الٰہی، مذہبِ انسانیت کا اثبات اور اس کی صحیح اشاعت، کتاب کا واحد مقصد ہے۔

وما توفیقی اِلّا باللہ

ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة

اشاعت دین وتجدید ایمان
کے
قرآنی اصول

حق کو بزور و قوت جبراً منوانا شان حق سے بعید ہے۔ جبر و استبداد کے طوق و سلاسل میں اجسام جکڑے جا سکتے ہیں، مگر قلوب احسان و مودّت و رحمت کے دلوانے و گرویدہ ہوتے ہیں۔ دل اسی کے آگے بذوق و شوق جھک جاتا ہے، جس کے اختیار میں اپنی صلاح و خیر و فلاح اور جس کی رحمت و توجہ سے اپنی زندگی کو وابستہ سمجھتا ہے اور جس سے انحراف و سرکشی کرکے اس کے فضل و رحمت سے محروم رہتے ہیں، اپنی عارضی و ابدی تباہی و بربادی دیکھتا ہے اسی لئے حکم ہے۔

فذکر بالقرآن من یخاف وعید

(ترجمہ) قرآنی طریقہ پر نصیحت کرو اس کو جو عذاب سے ڈرتا ہے۔

انسان جب اس حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے آزمائش کا مقام ہے، امتحان اور آزمائش کے اس دور میں اگر وہ ناکام رہیگا تو عارضی و ابدی نقصانات اس کے لازمی نتائج ہیں تو خوف الٰہی اس کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان بندہ ہے، بندگی ہی اسکی یافت و وجدان ہے۔ بصر و بصیرت میں ہے فکر و نظر کو تیز کر دیجئے۔ حق سے غافل، حق کا طالب بندۂ حق ہو جائیگا، اصلاح کا قدرتی طریقہ

فکر و نظر کی اصلاح ہے، عمل نظر کے تابع ہوتا ہے۔ اللہ بزرگ و برتر کے جن قوانین رحمت میں، جن بے حد و شمار نعمتوں میں انسان جی رہا ہے، علم حق کی روشنی میں ان کا مشاہدہ کرایا جائے، تو حبِ الٰہی کا فطری جذبہ بیدار ہوجاتا ہے۔ **خوف و محبت** ان ہی دو فطری جذبات کا تعلق خالق و رب سے قائم کرکے بچھڑے ہوئے بندوں کو ان کے خالق و رب سے وابستہ کرنے کی کوشش انبیائی طریقۂ کار اور قرآنی حکمت ہے۔

۱ اُدعُ الیٰ سبیلِ ربک بالحکمۃ

(ترجمہ) اپنے رب کے راستہ کی دعوت حکمت کے ساتھ دو۔

نیز حکمت یہ ہے کہ دین کو چند اعتقادات و عملیات کے مجموعہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حقیقی فطری نظریۂ حیات کی حیثیت سے اس طرح ثابت کیا جائے، کہ تمام انسانوں کا یہی ایک ضابطۂ حیات ہے، اسی کو قبول و اختیار کرنے ہی سے ان کی زندگی کامیاب و بامراد ہوسکتی ہے۔

جاہل انسان اپنی زندگی کا خود کو مالک و حاکم و مختار سمجھتا ہے، اور زندگی کے مسائل کو اپنی بے نور عقل سے حل کرنا چاہتا ہے، اپنی فطرت کے باطنی مطالبات سے غافل رہ کر صرف اسی چند روزہ زندگی کو مستقل زندگی سمجھتا ہے، انسان کے یہی تصورات و تخیلات باطل اور تمام امراض قلبی کی جڑ ہیں، حق کو اسی باطل سے آویزش ہے حق کی لڑائی ہمیشہ اسی باطل سے رہی، آج بھی اسی باطل کا شور و غوغا نوع انسانی کو غلط راستہ پر لے جا رہا ہے، اہل حق کو اسی باطل سے نبرد آزما ہونا ہے، حق اجسام و صور سے مخاطب نہیں ہے، بلکہ انسان کے جاہلانہ غیر فطری افکار و نظریات سے مخاطب ہے حق کے تیروں کا نشانہ قلب انسانی ہے۔ قلب، جہل کے خوش الحان ترانوں میں گہری نیند سو رہا ہے، یہ ترانے بند ہوجائینگے تو قلب بیدار ہوجائے گا قلب کی بیداری ہی باطل کی ہلاکت ہے۔ وہ دو بنیادی حقائق جن کو انسان ہمیشہ

فراموش کرتا رہا ہی ہیں، کہ انسان اپنے خالق و رب کا بندہ ہے اور اس کا یہ تعلق بندگی فطری و ابدی ہے، دوسرے یہ کہ ایک ابدی ہمہ خیر و بامراد زندگی بندے کی فطرت کا ایک حقیقی مطالبہ ہے، لذات وشہوات کی دنیا میں گم ہوکر جب انسان اپنی فطری حیثیت بندگی حق کو بھلا دیتا ہے، تو اُخروی ابدی زندگی کے فطری مطالبہ کو بھی بھول جاتا ہے، اور دنیا کی عارضی زندگی کے تعیشات وتنعمات ونمود ونمائش، تزئین و آرائش، کھیل تماشا، سیم و زر کے ذخائر اس کے مطلوب ومقصود ومحبوب ہوجاتے ہیں اور "دنیا برائے دنیا" کا غیر فطری تصوّر زندگی کے کاروبار کی اساس و بنیاد ہوجاتا ہے، اصلی اور حقیقی مرض یہی ہے، یہ مرض مشخص ہے۔ حکیم کائنات نے اس مرض کی تشخیص فرمادی ہے۔

ذالك بانهم استحبوا الحيواة الدنيا على الاٰخرة

(ترجمہ) اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں محبوب رکھا۔

حضرت معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

حُبّ الدنيا راسُ كل خطيئةٍ

(ترجمہ) دنیا کی محبّت تمام خطاؤں کی جڑ ہے۔

اشاعت دین یا تجدید ایمان کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ اولاً مرض کی تشخیص صحیح ہو اور اصلاح اس انداز سے ہو کہ یہ مرض بیخ و بن سے فنا ہوجائے، اور دنیا برائے آخرت یعنی عارضی زندگی برائے ابدی زندگی کا فطری و قرآنی تصوّر زندگی کے کاروبار کی اساس وبنیاد ہوجائے، جب تک مرض اور اس کے اثرات قلب کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے ہونگے۔ دین وایمان کی لذّت وشیرینی تلخ ہی معلوم ہوگی، اور دین کا وہ والہانہ جذبہ ہرگز پیدا نہ ہوگا، جو حضرات صحابہ کرام کی زندگیوں میں نظر آتا ہے اور نہ عزیمت، جہاد فی سبیل اللہ کا وہ شوق پیدا ہوگا، جو پیروان دین فطرت

کا امتیازی وصف ہے، صحیح اصلاح اور تجدید یہی ہے کہ ہماری زندگی حضرت نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی کا نمونہ ہو، ہماری وہی فکر و روش ہو اور ہمارے وہی جذبات و احساسات و عزائم ہوں جو صحابہ کرامؓ کے تھے، مصلح یا مجدد دراصل امراضِ قلبی کا حکیم ہوتا ہے۔ اگر تشخیص مرض اور ازالۂ مرض کے لئے اس کو معلّمِ حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بصیرت حاصل نہ ہو، تو اس کا اصلاحی طریقۂ کار ناقص رہیگا اور ایسا حکیم خود محتاجِ علاج ہوگا،

ہر انسان کی فطرت میں دید و لقاءِ رب کی خواہش موجود ہے، اور ایک ابدی ہمہ خیر بامراد زندگی کا مطالبہ بھی ہر انسان کی فطرت میں ہے جس کی تکمیل کا مقام ابدی عالم آخرت ہے۔ اشاعت و تجدید کا قرآنی طریقہ یہی ہے کہ ابدی ہمہ خیر زندگی حاصل کرنے اور دید و لقاءِ رب کے باطنی جذبہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی جائے، اگر دین کی تعلیمات سے دید و لقاءِ رب اور ابدی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کا شوق نہ پیدا ہو اور راہِ حق میں جان و مال کی قربانی کا جذبہ نہ ابھرے، تو سمجھنا چاہیئے کہ وہ تعلیم، نبوی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔

کلام، تصوف کی اصطلاحات کے بجائے دین کے حقائق و اصول کو کتاب و سنت کی روشنی میں ذہن نشین کرنے کا انداز اسی طرح ہونا چاہیئے، جس طرح وہ انسانی زندگی پر منطبق ہیں، اور جذبات فطری کے مطابق ہیں، اصلاح و تجدید کا یہی طریقہ قرآنی اور مطابق فطرت ہے، مُصلح کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر فکر و نظر کا ماخذ صرف کتاب و سنت کے محکمات ہوں، اور اس کا ہر ارشاد ان ہی محکمات کے مطابق ہو عام ازیں کہ اس کا تعلق دین سے ہو یا کمالِ دین سے، اس پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہو کہ دینِ حق اور فطرتِ انسانی کی ہم آہنگی بصیرت محمدیہ ہے۔

یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ

احوال واقعی

ان الانسان لفی خسر

انسان فطری طور پر ایک مرکز اعلیٰ و عظیم سے وابستہ ہونے کے باوجود اسی اصلی مرکز سے برگشتہ ہے، اور فتنہ و فساد، خون خرابہ، انتشار و پراگندگی کے ایک ہولناک دور سے گزر رہا ہے، حالانکہ فطرتِ انسانی ایک مامنِ سکون و سلامتی، صلاح و خیر کی طالب ہے یہ تشنگی اسی وقت دور ہو سکتی ہے، جبکہ تمام انسان فطری طور پر جس مرکز اعلیٰ و عظیم سے وابستہ ہیں، اسی کو اپنے علم و عمل کا مرکز بنا لیں کیونکہ وہی ذاتِ اعلیٰ و عظیم مبداء خیر و صلاح ہے، اور انسان کی زندگی علم و عمل کا نام ہے، علم و عمل کی صحت پر خیر و صلاح منحصر ہے صحتِ علم و عمل کا مرکز وہی ذاتِ علیم و خبیر ہے، ہمہ دان و ہمہ خیر ہے، جس کے مقرر کردہ نظام حیات سے انسان فطرتاً وابستہ ہے۔

انسان کے اعضائے ظاہری و باطنی کا نشو و نما، ان کا بقاء، ان کی صحت و سلامتی کے لئے قدرت کی پیدا کردہ اشیاء اور قدرت کے مقررہ قوانین کو نہ ترک کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے، انسان اس معاملہ میں اللہ بزرگ و برتر کے اٹل قوانین قدرت کا اس درجہ محتاج اور پابند ہے کہ اس کے بغیر صحت جسمانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کے لئے یہ قوانین بلا لحاظِ نسل و رنگ و ملک و قوم یکساں جاری و نافذ ہیں احیات

و پرورش و بقاء انسانی کے نظام کی اس وحدت کو تسلیم کرنے کے بعد کس طرح اس صداقت کو جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ان قوانین کو نافذ، جاری کرنے والے خدائے دو جہاں کی عبادت و اطاعت کا ایک ہی نظامِ علم و عمل تمام بنی آدم کے لئے ضروری ہے، جسمانی صحت و تندرستی کے ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت میں جب تمام انسان جکڑے ہوئے ہیں تو اطوار و عادات و خصائلِ انسانی اور زندگی کے تمام کاروبار کو انجام دینے کا ایک ہی الٰہی دستورِ انسانیت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرنا عقل و فہم کی بڑی کوتاہی ہے، غیر فطری افکار کے ائمہ کی یہ غلط تحریک کہ تمام مختلف مذاہب حق ہیں، کسی کو کسی پر کوئی فوقیت و برتری نہیں ہے، کچھ اس وجہ سے جڑ پکڑتی جا رہی ہے کہ عام طور پر مسلم ہوں کہ ہندو، عیسائی، سکھ، پارسی، مہذّب و غیر مہذّب دینِ فطرت سے ناواقف ہیں۔ انسان جب اپنے مرکزِ اصلی سے برگشتہ ہو جاتا ہے تو اپنی فطرت سے بھی جاہل بن جاتا ہے، دنیا چاہے تسلیم کرے یا نہ کرے، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں صرف ایک ہی دینِ فطرت ہے، انسان کی ناواقفیت اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈال سکتی البتہ یہ ناواقفیت خود انسان کی عاقبت تباہ کر دیتی ہے۔

دینِ فطرت وہی دین ہے، جو سازگارِ فطرتِ انسانی ہے، جو جذباتِ انسانی کے صحیح استعمال اور مطالبات و مقتضیاتِ فطرت کی تکمیل کا واحد ذریعہ ہے یا یوں سمجھیے کہ وہی فطرتِ انسانی ہے، سیرتِ انسانی ہے، دینِ فطرت اور انسانیت دو مترادف الفاظ ہیں، انسانیت ایک ہی ہے، انسانیت کو کسی ملک و قوم و نسل میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا، انسانیت ناقابلِ تقسیم ہے، وہ متفرق و متعدد نہیں ہے، لہٰذا دینِ فطرت بھی ایک ہی ہے۔ ملک و قوم و نسل و رنگ کے اختلافات کو دیکھ کر نوعِ انسانی کے لئے مختلف ادیان کا وجود تسلیم کرنا اور سب کو

برحق سمجھنا سراسر جہل وگمراہی ہے، جس کو حق وصداقت سے کوئی نسبت نہیں ہے۔
دین فطرت تمام کائنات کا دین ہے، ذرہ ذرہ کا دین ہے، ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ ہر شے، ہر ذرہ اللہ جل شانہٗ کا مطیع و منقاد ہے، اسی کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہے، یہی اطاعت و انقیاد، تسلیم و رضا، دین فطرت، دین حق ہے، فطرتِ سلیمہ اس کے خلاف فیصلہ نہیں کر سکتی۔
دین فطرت سرتاپا مرضئ حق کا نام ہے خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے انسانوں کا دنیوی و اخروی مفاد اسی میں ہے کہ ان کی زندگی خدا کی مرضی کے مطابق بسر ہو، دین فطرت کی خصوصیت یہی ہے کہ انسانوں کی پوری زندگی کو احاطہ کئے ہوئے ہے، بندہ پر بندہ ہونے کا اطلاق جب ہی ہوسکتا ہے کہ اس کی پوری زندگی، زندگی کی ہر حرکت و سکون بندگی کی تعریف میں آجائے، اس کی زندگی کے تمام کاروبار معاملات چاہے وہ منزلی زندگی سے متعلق ہوں یا مدنی زندگی سے، ہدایاتِ رب کے تحت انجام پائیں، جس میں فرد و جماعت دونوں شامل ہیں، دین فطرت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کو قبول کرنے میں قلب انسانی کوئی تنگی و گرانی محسوس نہ کرے انداس کے اصول و احکام انسانی غیرت و خودداری کے خلاف ہوں اور نہ وہ انسانوں کو اس بات پر مجبور کرتے ہوں، کہ وہ دوسرے انسانوں کی غلامی کو اختیار کرے یا ایک انسان دوسرے انسان کا فقیر و محتاج بن کر رہے، دینِ فطرت براہِ راست قلبِ انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے، قلب انسانی میں انس و محبّت کا جذبہ بھی ہے اور غضب و عداوت کا جذبہ بھی، اطاعت و انقیاد، بندگی کا جذبہ ہے اور حکومت و کارفرمائی کا جذبہ بھی ہے۔ دینِ فطرت میں ان ہی فطری جذبات کی تربیت ہے، ان ہی فطری جذبات کے اعتدال و توازن کا نام عدل واحسان ہے، دینِ فطرت میں عدل و احسان کی بنیاد پر انسانی زندگی کی تعمیر کی جاتی ہے، اس کے بغیر انسان صفاتِ انسانی سے متصف ہوکر

اُخروی زندگی میں بقاءِ رب اور ابدی نعمتوں کا مستحق نہیں ہو سکتا، یعنی اپنی فطرت کے اصل مقاصد کو نہیں پا سکتا۔

دینِ فطرت کو خالص علمی و تحقیقی دین ہونا چاہیئے۔ تحقیقی و علمی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی مقدس اور اعلیٰ و پاکیزہ تخیّل و کردار انسان کی غور و فکر اور دماغی قابلیت کی ایجاد ہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ خالقِ فطرت نے اپنے تمام بندوں کے لئے بلا لحاظِ ملک و قوم، نسل و رنگ ایک مکمل و جامع آئینِ بندگی، عبادت و اطاعتِ حق کا مکمل نظامِ علم و عمل نازل فرمایا ہو، جس کے اصول و حقائق کے مصداقات فطرتِ انسانی میں موجود ہوں، جو اس کے دینِ حق ہونے کی گواہی دے رہے ہوں اور جس کے مبیّنہ اصول و احکام میں اور فطرتِ انسانی کے اُن جاذبات، مطالبات و مقتضیات میں رتی برابر فرق نہ ہو جن کا تعلق انسان کی عارضی و ابدی زندگی سے ہے۔

انسان اپنی حالت پر غور کرے وہ خود اپنی کوئی راہ متعین نہیں کر سکتا خارجی حالات اور لذات و شہوات کے مطالبات جس راہ پر ڈال دیتے ہیں اسی پر گامزن ہو جاتا ہے۔ ہر فانی قوت کے آگے اس طرح جھک جاتا ہے کہ اوصافِ حمیدہ کو خیرباد کر دیتا ہے، اتنا محتاج و عاجز ہے کہ بغیر کسی سرپرست و معاون و رہبر کے طفولیت و شباب کے منازل طے نہیں کر سکتا۔ آرام و اطمینان چاہتا ہے، مگر غیر فطری افکار کو اختیار کرنے کی وجہ سے مبتلائے فکر و آلام رہتا ہے، امن و راحت چاہتا ہے، خوف و حزن دامنگیر رہتے ہیں، حزن و غم سے جتنا فراری ہے اتنا ہی ان سے دوچار ہے۔ فراغت و خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو اپنے ہی مقرر کردہ حقوق و فرائض کی ادائی سے غافل ہو جاتا ہے۔ مشکلات و مصائب میں اس قدر مایوس، حیران و سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ کہ غیرت و خودداری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اپنے

ذاتی اغراض کی خاطر دوسرے کے واجبی حقوق کو نظر انداز کر دیتا ہے، مدنی و منزلی زندگی کا ضابطہ مدوّن کرتا ہے، تو تمدن و معاشرت کا اعتدال و توازن بگڑ جاتا ہے، اخلاق و کردار کی درستی کے آئین مرتب کرتا ہے، تو اخلاقی پستی و بداعمالیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، حفظانِ صحت کے اصول بناتا ہے، تو نئے نئے امراض شائع ہوتے رہتے ہیں۔ صیانتِ حقوق کے قوانین وضع کرتا ہے تو ظلم وحق تلفی بڑھتی جاتی ہے، تعزیری احکام نافذ کرتا ہے تو جرائم کی کثرت ہوجاتی ہے۔ امن وسلامتی کے بین الاقوامی معاہدات' جنگ وجدال کی نت نئی صورتیں پیدا کرتے رہتے ہیں، غرض امن کی ہر کوشش جنگ پر' صلح کی ہر تجویز فساد پر' منتج ہوتی ہے، ہر تعمیری جد وجہد تخریبی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ راحت وآسائش کے لیے' جو چیز بھی ایجاد کی جاتی ہے' تباہی وبربادی کا سامان ہو جاتی ہے۔

تجربات ومشاہدات کی یہ گواہی کیا اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ حیات آفریں ہی محافظ حیات ہے۔ فطری جذبات کی تربیت اور مطالباتِ فطرت کی تکمیل خالقِ فطرت ہی کر سکتا ہے خالقِ فطرت ہی رہنمائے فطرت ہے۔ اور انسان خالقِ فطرت کے احکام وہدایات کے بغیر پرامن زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

یہ بات کس قدر واضح ہے کہ پیدا کرنے والا ہی اپنی مخلوق کا حاجت روا' مالک وحاکم ہوگا، اپنی مِلک پر اسی کی حکومت' حقیقی عدل وانصاف ہے ایک غلام دوسرے غلام پر' ایک مملوک دوسرے مملوک پر حکومت کرنی چاہیگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ آپس میں اپنے اپنے ذاتی اغراض کے لئے جدال وقتال، غارت گری وخون ریزی کرتے رہیں گے نہ حقوق انسانی کی حفاظت ہوگی اور نہ کسی کی زندگی امن وراحت سے بسر ہوگی، آج محکوم اقوام ہوں کہ حاکم اقوام' ان کے دل ودماغ پر جو غیر فطری افکار وخیالات مسلط ہیں اور

اور ان میں جو انسانیت سوز اعمال و کردار پائے جاتے ہیں، اور ادنیٰ اور متوسط طبقہ جن معاشی مشکلات میں مبتلا ہے، اور سرمایہ داروں کے خلاف مزدور طبقہ کی بغاوت و جارحانہ اقدام رب و مولا سے نسبتِ غلامی کو منقطع کرنے کا نتیجہ اور رب و مولا کے ہدایات و احکام جو عدل و احسان پر مبنی ہیں اور باہمی انس و محبت کے جذبات کو بیدار رکھتے ہیں، ان سے روگردان ہونے کا قدرتی ردِ عمل ہے۔

انسان اس عالم میں کیوں پیدا کیا گیا؟ خالق و دیگر مخلوق سے اس کا کیا فطری ربط و تعلق ہے؟ ہر ایک کے حقوق و واجبات کیا ہیں اور انسان کے فرائضِ زندگی اور مقاصدِ حیات کیا ہیں؟ یہ وہ مسائل ہیں جن کے متعلق اس کو پیدا کرنے والے کے سوا کوئی اور صحیح علم و ہدایت نہیں دے سکتا۔ انسان کو خلیفہ نائب بنانے والے نے ان امور کے متعلق علم و آگہی بخشی، اور ایک دستورِ رحمت عطا فرمایا جس کو اختیار کر کے انسان اپنے رب و مولا کی غلامی میں رہ کر اس کے حسبِ مرضی اس کی مخلوق پر حکومت کرنے اور ہر ایک کے حقوق و واجبات کو کما حقہٗ ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے اور فطری جذبۂ حکومت کو استعمال کرنے میں وہ حدودِ عبدیت سے متجاوز نہیں ہو سکتا۔ اس کے بغیر انسان کی زندگی فاسد عناصر سے پاک اور افراط و تفریط سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔

انسان کی انفرادی و اجتماعی، منزلی و مدنی زندگی کے تمام معاملات و کاروبار کے متعلق ایک جامع دستور جو بیک وقت اللہ کی فرماں برداری کا مکمل ضابطہ اور دنیا پر حکومت کرنے کا مکمل آئین بھی ہو خالقِ فطرت کے سوا اور کوئی مرتب کرےگا تو وہ ناسازگارِ فطرت ہوگا، جس کی وجہ سے انسان کا نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائےگا۔ خالقِ انسان کا نازل کردہ دستور انسانیت ہی فطرت کے موافق ہوگا، جس پر

عمل کرنا ہی اللہ کی عبادت کرنا ہے اور وہی صحیح طریقۂ زندگی ہے، لیکن اکثر لوگ اس دینِ فطرت، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کے صحیح نظامِ فکر و عمل انسان کی منزلی و مدنی زندگی کے مکمل آئین کو بھی خود ساختہ ادیان کی طرح پوجا پاٹ، تسبیح و مصلے کی حد تک محدود مذہبی نظام سمجھتے ہیں، اور دینِ فطرت کے اس وسیع مفہوم سے ناآشنا ہیں جس کی کاملیت، جامعیت و وسعت کی مختصر توضیح سطور بالا میں کی گئی ہے، جو اپنی اس جامعیت و کاملیت کی وجہ سے دینِ حق، دینِ فطرت ہونا ثابت ہونے کے لئے منطقیانہ و فلسفیانہ دلائل سے مستغنی ہے۔

دینِ فطرت یعنی بندگیِ حق پر قائم رہنے کے لئے ایک کامل نمونہ بندگی، نمونۂ انسانیت کا بھی دنیا میں ہونا، اللہ رحمٰن و رحیم کے تمام بندوں کو اللہ کی عارضی و ابدی رحمتِ خاص کا مستحق بنانے کے لئے، ایک مجسم رحمت کا دنیا میں تشریف لانا اور آنے والی نسلوں کے لئے اُن کی حیاتِ طیّبہ کا جیتی جاگتی دنیا تک محفوظ رہنا انسانوں کی ایک فطری ضرورت ہے۔

رحمۃ للعلمین

محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ بزرگ و برتر کے جاری کئے ہوئے ایک ہی نظامِ حیات و ممات میں جکڑے ہوئے انسانوں کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان کی صلاح و خیر و فلاح کے لئے دنیا میں ایک ہی مرکزِ رشد و ہدایت ہو۔ بندگی حق جو انسان کی فطری خواہش ہے اس کی تکمیل کے لئے اور خلافت جو بندۂ حق کا منصب ہے اس کی فطری قابلیتوں کو روبہ عمل لانے کے لئے بندگی حق و خلافت الٰہیہ کا ایک بہتر و مکمل نمونے سامنے رکھے بغیر، انسان نہ بندۂ حق ہو سکتا ہے اور نہ خلافت کی قابلیت اُجاگر ہو سکتی ہے۔ انسان کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ انسان ہی کی صحبت و انسان ہی کی زندگی سے درسِ انسانیت حاصل کرتا ہے فطرتِ انسانی کے اس تقاضے کو جس ذات اقدس کی بعثت سے خالق انسان نے پورا کیا وہ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وصحبہ وسلم

ہیں۔

سلام اے آتشیں زنجیر باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے (ماہر)

تمام انسانوں کے لئے آپ ہی کی ذاتِ گرامی رشد و ہدایت کا واحد مرکز ہے اور آپ ہی کی حیاتِ طیبہ بندگی حق و خلافت الٰہیہ کا جامع و مکمل و بہترین نمونہ "اسوۂ حسنہ" ہے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ ذات اقدس کی حیاتِ طیبہ کے سوا آج کسی اور فرستادۂ الٰہی

کی سوانح زندگی دنیا کے سامنے نہیں ہے۔ اور نہ آپ کے لائے ہوئے آئین بندگی "القرآن" کے سوا کوئی اور اللہ کی کتاب دنیا میں موجود ہے یہ حقیقت اس صداقت کو تسلیم کرنے کی دعوت دے رہی ہے کہ آپ کے "اسوۂ حسنہ" سے درسِ انسانیت حاصل کئے بغیر عدل، واحسان اور امن وسلامتی کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔

سنتِ الٰہی یہی ہے کہ بنی آدم کی فلاح وخیر کے لئے بنی آدم ہی کے منتخب و برگزیدہ حضرات کو معلّمِ انسانیت، بندگیٔ حق کا نمونہ بنا کر بھیجا جاتا رہا تا آنکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو کامل و جامع معلّمِ انسانیت کا شرف عطا فرما کر سلسلۂ نبوت کو ختم فرما دیا گیا، اور انسان کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا سامان فراہم کر دیا گیا، اس کامل نمونۂ انسانیت سے جو حضرات فیض یاب ہو کر نکلے اور دنیا سے بہیمیت کو دور کر کے دنیا کو انسانیت کا جو سبق دیا دنیا اس کو فراموش نہیں کر سکتی، آج اقوامِ عالم میں انسانیت کے جو کچھ مٹے ہوئے ظاہری آثار پائے جاتے ہیں، اگر وہ اپنے دامن میں منہ ڈال کر غور کریں تو اپنے قلب کو ان ہی حضرات کے احسانات کا معترف پائیں گے، اسوۂ حسنہ اور ان حضرات کی روش کے خلاف جو مسلک و رویّہ ہے وہ فطرتِ انسانی کے لئے ناقابلِ قبول بھی ہے اور خالقِ فطرت کے غضب و عتاب کا موجب بھی ہے۔ تجربہ و مشاہدہ شاہد ہے

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس "سراج منیر" ہی کی روشنی سے اپنی شمع حیات کو روشن رکھے بغیر انسان ظلمت کدۂ دہر سے امن وسلامتی کے ساتھ گزرتا ہوا منزلِ مقصود، ابدی بامراد زندگی کو نہیں پا سکتا، دنیا میں بسنے والے انسان دیکھ لیں گے کہ بالآخر عدل و احسان، امن وسلامتی کے پیاسے انسان اسی آبِ حیات سے اپنی پیاس بجھائیں گے اور "رحمۃ للعٰلمین" کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہو کر ہی اللہ رحمٰن و رحیم کی عارضی و ابدی رحمت خاص سے سرفراز ہونگے، یہ حقیقت

انشاء اللہ تعالیٰ ظاہر ہو کر رہے گی۔

دنیا کے گوشہ گوشہ میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کی مخالفت کی جا رہی ہے، مخالفت زندہ کی ہوتی ہے مردے کی نہیں ہوتی کیا یہ مخالفت اس حقیقت کا ثبوت نہیں ہے کہ دنیا میں آپ ہی کی لائی ہوئی تعلیمات زندہ ہیں، اور ہر اس شخص کو جو زندگی چاہتا ہے دعوتِ حیات دیتی ہیں۔

خالقِ انسان کا یہ اعلان خالقِ انسان ہی کے الفاظ میں آج بھی دنیا کے سامنے موجود ہے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ (النساء ع)

(مطلب) اے ظلمت و تاریکی میں بھٹکنے والے انسانو! تمہاری تربیت کرنے والے، تمہاری حاجت روا کی طرف سے تمہارے پاس رسول برحق بندگیٔ حق کا کامل نمونہ بن کر آچکا ہے۔ تمہاری فلاح و صلاح و خیر اسی میں ہے کہ تم اس ہادی برحق کے "اسوۂ حسنہ" کی روشنی میں اس پر نازل کئے ہوئے مکمل آئین بندگی "القرآن" کو اپنا نظام حیات بنالو۔ حقیقت کی یہی روشنی تمہارے افکار و کردار کی ظلمتوں کو دور کر سکتی ہے۔

رسالت محمدیہ کی بعثت سے خالق انسان نے انسان کی ایک اہم و عظیم فطری ضرورت کی تکمیل فرمادی اور انسان پر اپنی نعمت تمام کر دی اس نعمت عظمیٰ، اس فضل و احسان کی ناقدری کے یقینی ثمرات وہ عارضی و ابدی نقصانات ہیں دین فطرت میں جن کا نام فتنہ و فساد، خوف و حزن، خون خرابہ اور ابدی سوز و تپش کی زندگی "جہنم" ہے۔

هدیً و رحمة

قرآن کا تعارف

فطری جذبات، فطری مقتضیات، فطری داعیات سے انسان باخبر ہو کر فطری قابلیتوں کو اُجاگر کرنے اور رو بہ عمل لانے کے لئے خالقِ فطرت نے اس کو جو روشنی بخشی ہے اس کا نام القرآن ہے۔

قرآن کتاب اللہ ہے، کلام اللہ ہے، یہ انسانی ادعا نہیں خود اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ وہ الہٰی کتاب ہے۔ اس کے الفاظ اور جملوں کی ترتیب الہٰی ترتیب ہے۔ خالقِ فطرت نے اس کتاب کو جن الفاظ میں نازل فرمایا، بعینہٖ ان ہی الفاظ میں یہ کتاب لکھی ہوئی ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کو اللہ بزرگ برتر نے اپنے تمام بندونکی صلاح و خیر اور دنیا و آخرت کی فلاح کے لئے نازل فرمایا ہے۔ یہی تمام بندوں کے لئے مکمل و جامع دستور بندگی ہے۔ اس میں وہی حقائق بیان کئے گئے ہیں جس کے مصداقات انسان کی فطرت میں موجود ہیں، یہی وہ نور ہے جس کے بغیر عقل انسانی اندھی ہے۔ اس میں حیاتِ انسانی کا حقیقی نظریہ اور حیات انسانی کا پاکیزہ نظام ہے۔ اس کے بغیر افکار میں بلندی اور کردار میں پاکیزگی اور خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اللہ بزرگ و برتر کے تمام بندے چاہے ان کا تعلق کسی ملک و قوم سے ہو ایک رشتہ اخوت میں منسلک نہیں ہو سکتے جب تک ان میں وحدتِ افکار و وحدتِ کردار نہ ہو، جب تک ان کا مطلوب و مقصود، ان کے فرائض حیات ایک نہ ہوں، ان کا نظام زندگی اور آئین بندگی ایک نہ ہو، یہی قرآن ہے۔

لفظِ قرآن کے معنی ہی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ منتشر اور پراگندہ انسانوں

کو ایک ہی مرکز پہ جمع کرتا ہے۔ اسی کا ایک نام فرقان بھی ہے۔ یعنے حق و باطل میں فرق کر کے اس حقیقت کو پیش کرنے والا جس کو قبول و اختیار کئے بغیر انسانیت کی تعمیر اور امن و سلامتی کی دنیا آباد نہیں ہوسکتی۔ انسان بحیثیت انسان ایک ہیں اُن کے افکار، کردار، مطالبات بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ عقل سلیم، فطرت انسانی کا یہی تقاضا ہے۔ افکار، کردار، اور مقاصد کی یہی وحدت شجر انسانیت کا تخم ہے۔ قرآن کی یہی دعوت ہے۔

آج دنیا میں صرف القرآن ایک کتاب ہے وہ جس زبان عربی میں نازل ہوئی ہے بجنسہٖ اُسی زبان میں محفوظ ہے اس واقعہ پہ تاریخی حیثیت سے تحقیق کی مہر ثبت ہے اور اس کتاب کی زبان بھی ایک زندہ و علمی و کاروباری زبان کی حیثیت سے کسی ایک ملک میں نہیں بلکہ اقطار عالم میں موجود ہے۔ اس کتاب کا انداز بیان شروع سے آخر تک بتا رہا ہے کہ اللہ بزرگ و برتر اپنے بندوں سے مخاطب ہے اور اپنے بندوں کو زندگی کے تمام کاروبار و معاملات انجام دینے کی تعلیم و ہدایت دے رہا ہے۔ اور ان کے فطری جذبات کی تربیت فرما رہا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس حیثیّت کی کوئی کتاب آج دنیا میں موجود نہیں ہے۔

القرآن جس دینِ فطرت کو پیش کر رہا ہے وہ کوئی نیا دین نہیں ہے از حضرت آدم علیہ السلام تمام بنی آدم کے لئے صرف ایک ہی دین فطرت نازل ہوتا رہا جس کا نام قرآنی اصطلاح میں دین اسلام ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ اسلام تیرہ ۱۳ سو برس کا دین ہے، اسلام اور انسانیت کی پیدائش ایک ہی ساتھ رہی ہے۔ انسانیت جتنی قدیم ہے دین اسلام بھی اتنا ہی قدیم ہے، البتہ اپنی کاملیت و جامعیت کے لحاظ سے اس کا جدید دور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم

کی بعثت سے شروع ہوتا ہے، اس وقت دنیا میں جو مختلف مذاہب و مسلک رائج ہیں، وہ دین فطرت ہی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ اور مسلمانوں کی اکثریت بھی حقیقی طور پر دین فطرت پہ عامل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ اور اس کو سنوارنے کے فطری تقاضے پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمسائیہ قوم کے مفکرین قرآن و گیتا ایک ہونے کے زعم باطل میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک دھوکہ ہے، صاف و صریح دھوکہ، گیتا کی تمام تر گیتوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ ایک انسان کو جدال و قتال پر آمادہ کیا جائے، جدال و قتال کے انسانی جذبات نغموں، گیتوں اور افسانوں سے بھی برانگیختہ ہو سکتے ہیں۔ مگر انسانی زندگی کی تعمیر اور اللہ سے بچھڑے ہوئے بندوں کو اللہ سے وابستہ کر کے ان کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا حقیقی تعلیمات ہی کا اعجاز ہے۔ قرآن ان ہی حقائق کا مکمل مجموعہ ہے۔ قرآنی تعلیمات سے انسان کا فطری جذبہ حکومت بھی اس طرح رونما ہوتا ہے کہ اس کی حکمرانی بھی انسان کی فطری حیثیت عبدیت ہی کو نمایاں و ثابت کرتی ہے۔ انسان کے اِدّعائے ملک و حکومت کی اساس دراصل مملوکیت و محکومیت ہے۔ قرآنی تعلیمات سے جب یہ مملوکیت و محکومیت شعور میں آجاتی ہے تو حکومت کا فطری ملکہ فتنہ و فساد اور شرورِ نفسی سے پاک کر دیا جاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات میں کائنات سے صرفِ نظر نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیمات میں احتسابِ کائنات ہے زمانہ کی اتباع نہیں ہے بلکہ زمانہ ستیزی ہے۔ باطل سے دوستی نہیں ہے بلکہ باطل سے آویزش ہے۔ نباتات و جمادات کی طرح سکوت و جمود نہیں ہے بلکہ ہنگامہ آرائی ہے۔ خالق فطرت کے سامنے سرافگندگی ہے تو مخلوق کے مقابلہ میں سربلندی ہے۔ خالق سے نیازمندی ہے تو مخلوق سے بے نیازی۔ قرآن ہی کی تعلیمات مرد آفریں، مرد آزما ہیں۔ اسی میں ابدی حیات نو کی تعمیر کا مکمل سامان ہے۔ ابدی ہمہ خیر زندگی

انسان کی فطرت کا باطنی مطالبہ ہے ۔ جب تک انسان اپنے فطری باطنی مطالبہ کی حقیقت کو سمجھ کر اس ابدی ہمہ خیر زندگی ، انسانی زندگی ، جذبات واحساسات کی زندگی کو مطلوب ومقصود نہ بنائے گا اس میں صحیفۂ فطرت "القرآن" کی دعوتِ الی الحق بالفاظ دیگر دین فطرت کو قبول واختیار کرنے کی قابلیت پیدا نہ ہوگی۔ اور اگر اس کو قبول واختیار نہ کرے گا تو سوز وتپش، درد واذیت کی ابدی زندگی اس کا قدرتی انجام ہے ۔ سنت الہٰی اور قانون فطرت یہ ہے کہ قرآن مومن کے لئے ہدایت وشفاء ہے ، مومن کو وہ گمراہیوں سے اور امراض قلبی سے محفوظ رکھتا ہے ۔ مومن ہونے کے معنیٰ یہی ہیں کہ اس کی زندگی کے کاروبار میں حتی الامکان قرآن ہادی ہوجائے ، جو مومن نہیں ہے قرآن پڑھنے سے اس کو نقصان ہی زیادہ ہوگا ، اور اس کی گمراہی میں اضافہ ہوتا جائیگا ۔

جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے لئے اور تمام دنیا کے لئے آخری ہادی برحق نہیں سمجھتے ہیں ، آخرت کی زندگی کو نصب العین بناکر بندگی حق پر قائم نہیں ہیں بالفاظ دیگر مومن نہیں ہیں ۔ سنت الہٰی یہ ہے کہ شیطان کو ان لوگوں کا دوست بنا دیا جاتا ہے ۔

إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ (الاعراف)

ایسے لوگوں کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر شر کو خیر کی صورت میں پیش کر کے لوگوں کو راہ حق سے بھٹکانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں ۔ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں ۔ اس زمانے میں شیطان کے ایسے کارندے بہت نکل آئے ہیں ۔ مسلمانوں اور تمام انسانوں کے لئے وقت کی اہم ضرورت یہی ہے کہ وہ حسب مفہوم صحیفۂ فطرت "القرآن" مسلم ہوجائیں ۔

وَاِذَا حَکَمْتُم بَیْنَ النَّاسِ اَن تَحْکُمُوا بِالْعَدْلِ

دینِ فطرت وسیاست

دین فطرت کا دعوتی کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے اس کو محض ایک مذہبی پیام سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہی پیام سیاسی شعور کی بھی اساس و بنیاد ہے۔ قبل ازیں کہ اس اجمال کی مختصر تشریح و تفصیل بیان کی جائے لفظ سیاست کا مفہوم اور دنیا میں انسان کا جو درجہ و منصب ہے اس کا فطری تصور پیش کیا جاتا ہے۔

سیاست کے لغوی معنی ہیں "خود آزاد رہ کر دوسروں کو اپنا محکوم و غلام بنانا" چاہے یہ عمل ایک قوم کا دوسری قوم کے ساتھ ہو یا کسی قوم کے خاص خیال و فکر رکھنے والے افراد کا اپنی قوم کے دیگر افراد کے ساتھ ہو۔ دوسرے معنی ہیں "رعیت پروری کردن" جس کا مطلب یہ ہے کہ جن انسانوں پر غلبہ و اقتدار حاصل کیا جاتا ہے اور ان کو اپنا مطیع و محکوم بنا کر رکھا جاتا ہے اندرونی و بیرونی خطرات سے ان کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کرنا، ان کی اخلاقی و معاشی حالت کو درست رکھنا اور ان پر اس طرح حکومت کرنا کہ بغاوت و سرکشی کا تصور ان میں پیدا نہ ہو، اور شریر النفس افراد کو اپنے فاسد خیالات پھیلانے کا موقع نہ ملے جو عموماً حکومت کے وقار اور بقاء کے لئے مہلک ہوا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ حاکم بن کر رہنا اور اپنی حکومت کو قائم رکھنا ہی سیاست ہے، تدبر اس طریقہ حکمرانی کا نام ہے جو سیاست کے متذکرہ صدر منشاء کو کما حقہٗ پورا کر سکتا ہے۔ حکومت کا

تدبر، جس قدر ناقص ہوگا اس کی سیاست بھی اسی قدر کمزور ہوگی۔ سیاسی قوت کے مفہوم میں وہ تمام ذرائع داخل ہیں جن کو اختیار کر کے غلبہ و اقتدار حاصل اور اس کو باقی رکھا جاسکتا ہے، کسی قوم کے افراد میں جب یہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ دوسروں کے محکوم و زیرِ اقتدار نہیں رہیں گے، بلکہ حکومت کرنا خود ان کا فطری حق ہے تو اسی جذبہ کو سیاسی شعور سے تعبیر کرتے ہیں سیاست کا عام مفہوم تو یہی ہے مگر خالقِ فطرت نے انسان کو سیاست کا جو فطری شعور عطا فرمایا ہے اور جو دنیا میں بندگانِ حق کا منصب ہے وہ یہ ہے۔

اِنی جاعل فی الارض خلیفۃ

(ترجمہ) میں زمین پر اپنی طرف سے ایک حکومت کرنیوالے نائب کو بناتا ہوں

اولاد آدمؑ کو اسی منصب خلافت کی یاد دہی فرمائی جارہی ہے۔

وھوالذی جعلکم خلٰئف الارض

(ترجمہ) اور اسی اللہ نے تم کو زمین پر صاحب اختیار بنایا۔

حکومت کا جذبہ ہر شخص کی فطرت میں داخل ہے۔ اپنے اعضاء و جوارح، اہل و عیال اور ماتحتوں پر ہر شخص کی حکومت ہے ایک مقررہ الٰہی نظام کے تحت جمادات، نباتات حیوانات سب ہی انسان کے زیرِ اقتدار و تصرف ہیں۔ کلام الٰہی سے بطور وجدان و مشاہدہ ثابت ہے کہ انسان کا منصب یہی ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق پر اللہ کے زیرِ ہدایت حکومت کرے، جس دین کی تعلیم یہ ہو کہ خالق انسان نے انسان کو اپنی مخلوق پر نیابتاً حکومت کرنے کی قابلیت بخشی ہے، اس دین سے سیاست کو خارج سمجھنا کس قدر نادانی ہے۔ حاملانِ دینِ متین کی پستی و تنزل کے جو اسباب و وجوہ اس وقت تک بیان کئے گئے ہیں وہ بجائے خود صحیح ہوں کہ غلط مگر واقعہ یہ ہے کہ صدیاں گزر گئیں دینی تعلیم میں زہد و تقویٰ پر اس انداز سے توجہ فرمائی جاتی رہی

کہ مسلمانوں کے ذہن سے سیاست کا شعور جو انسان کی جبلت میں داخل ہے اور ایک مسلم و مؤمن کے بنیادی تصورات میں سے ہے زائل ہوتا گیا، اور مذہبی اشخاص کے دماغوں میں سیاسی قابلیت نہیں رہی، اغیار نے مسلمانوں کی ناواقفیت دینی سے خوب فائدہ اٹھایا اور اپنے غیر فطری افکار کی بنا پر سیاست و مذہب میں تفریق کر کے مسلمانوں کو ان کے دینِ حق سے جس میں سیاست دین جزو لاینفک ہیں برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب یہ ناقابل انکار واقعہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت کے ذہن میں یہ تصور جاگزیں ہے کہ دین سیاسی ترقی میں حارج و مانع ہے۔ جس دین فطرت کے دعوتی کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا مفہوم و منشا یہی ہے کہ نفس و شیطان ہو کہ جن و ملک و انسان ان کی محکومی و اطاعت ننگ انسانیت ہے، فطری حریت و آزادی کے منافی ہے۔ انسان جو اللہ کا بندہ و خلیفہ ہے اللہ کی بندگی و طاعت سے باہر و آزاد ہو کر نفس و شیطان، جن و انس کا غلام و تابعدار ہو جاتا ہے تو شرافتِ انسانی کو زائل کر دیتا ہے، ہمیشہ کے لئے ذلت و خواری، حزن و الم اس کی قسمت میں لکھے جاتے ہیں۔ اس کی شرافت و عزت، توقیر و تکریم اور عافیت و آسودگی کا راز یہی ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے مالک اصلی حاکم حقیقی کی بندگی و محکومی کو اختیار کر کے نفس و شیطان اور اس کی تمام مخلوق اور اس کے نافرمان بندوں پر اس کے عادلانہ دستور مملکت کے تحت حکومت کرے، یہی وہ عبدیت ہے جو اس عالم میں حقیقی آزادی ہے۔ اور جس کی جزا، وہ فطری مطلق العنانی ہے جس کی تعبیر قرآن میں لھم ما یشاؤن عند ربھم (ان کو اپنے رب کے پاس سے جو چاہیں گے ملے گا) سے کی گئی ہے، یہی وہ فقیری ہے جس میں کونین کی بادشاہی ہے، یہی وہ سرافگندگی ہے جس میں ابدالآباد تک سرفرازی ہی سرفرازی ہے۔ اس ذات اعلیٰ و عظیم،

حاجت روائے ہردوجہاں سے فقر واحتیاج کی فطری نسبت کو قائم و برقرار رکھکر اُس کے حسب ہدایت زندگی بسر کرنا، عارضی وابدی سرور وراحت، عشرت و شادمانی وسربلندی کا سرمایہ ہے، اسی در کی جبیں سائی میں امن وسلامتی ہے، عزت وغلبہ ہے، غور فرمائیے چند مختصر الفاظ سے جو حقیقت وصداقت کا مظہر ہیں سیاست وحکومت کا کتنا زبردست شعور پیدا ہو جاتا ہے، جس دین کی بنیاد ہی میں سیاسی شعور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، اس دین کو سیاسی ترقی میں مانع و حارج سمجھ کر اختیار نہ کرنا علمائے کرام سے فتویٰ مطلوب ہے، کفر ہے کہ ایمان؟ نیز دین کی ایسی تعلیم جس سے خوف الٰہی وحب الٰہی کے ساتھ ساتھ سیاست کا فطری جذبہ بیدار نہ ہو کیا دین کی صحیح خدمت ہو سکتی ہے؟ اس واقعہ سے کون انکار کرسکتا ہے کہ جس تدبر وسیاست کے آگے بڑے بڑے ارباب سیاست و مدبر حکمرانوں نے سر جھکا دیا، وہ اسی دین حق کا فیضان تھا، جس کو قبول اختیار کرنے والوں نے اجسام پر حکومت نہیں کی قلوب پر حکومت کی، ان کی رعیت کے دل توپ وتفنگ سے خائف نہیں تھے، بلکہ اُن کے حُسن سلوک کے گرویدہ تھے، وہ ان کی حربی قوت سے نہیں بلکہ تقویٰ وپارسائی کی طاقت سے مرعوب تھے وہ ان کی چالبازیوں کے معترف نہیں تھے بلکہ عدل واحسان کے معترف تھے۔ اس دین کی صحیح تعلیمات سے انسان میں جو فراست ودانائی اور جامعیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کا مقابلہ اس علم سے بے بہرہ رہ کر دیگر علوم وفنون والے نہیں کر سکتے۔ معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے،

اتقوا بفراسة المومن فانه ينظر بنور الله

(ترجمہ) ڈرو مومن کی فراست سے وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ سے عبدیت وغلامی کی نسبت سیاسی قوت کا وہ غیر فانی مبداء ہے۔

جس کو کبھی زوال نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر فانی قوت اسی ذات قوی و قدیر کے اشارۂ کن کے تحت کام کر رہی ہے۔

ان القوۃ للہ جمیعا

(ترجمہ) تمام قوت حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

دین کی صحیح تعلیمات سے آراستہ، بندۂ مومن کا یہ ایقان کہ اللہ جل شانہ کی قوت قاہرہ مومن کی پشت پناہ ہے وہ ایمانی توانائی ہے جس کے مقابل جوہری توانائی رکھنے والی ہر قوت سرنگوں ہو کر رہے گی، اور غلبہ و اقتدار اسی جماعت کو نصیب ہوگا جو ایمانی توانائی رکھتی ہے۔

فان حزب اللہ ھم الغلبون

(ترجمہ) اللہ کی جماعت بلاشبہ غالب رہنے والی ہے۔

اسلام کے کلمۂ دعوتی سے جو فطری سیاسی شعور پیدا ہوتا ہے اس کا ایک رُخ تو وہ ہے جو اجمالاً سطور بالا میں عرض کیا گیا ہے، اور جس کا تعلق دنیائے سعی و عمل سے ہے۔ اس کے دوسرے رُخ کا تعلق عالم جزاء سے ہے، جس کا تصور الوہیت کے مفہوم میں داخل ہے، اللہ جل شانہ کی فرماں روائی و شہنشاہی اس کی ذات کی طرح لازوال باقی رہنے والی ہے

وہ ایسا حاکم ہے جس کی مرضی کے خلاف زندگی بسر کرکے انسان اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا، دنیائے سعی و عمل کو آباد و قائم رکھنے والے فرماں روا کی شان سے بعید ہے کہ اُس کے پاس کوئی عالم جزاء نہ ہو، اللہ کے متعلق ایسا بے اختیار فرماں روا ہونے کا خیال کوئی صحیح العقل انسان نہیں کر سکتا، حقیقی فرماں روا، ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب دنیائے سعی و عمل کا ہنگامہ ختم کر دیا جائیگا تو میزان عدالت قائم کی جائے گی، اور عالم جزاء آباد کیا جائے گا اس کی بادشاہی

اس دنیا کی حد تک محدود و مقید نہیں ہے، کسی حکومت پر حکومت کا اطلاق اس وقت تک نہیں ہوسکتا، جب تک عدل و انصاف اور جزائے اعمال کا ایک اٹل و مکمل نظام بھی وہ نہ رکھتی ہو، تو پھر فرماں روائے ارض و سماء جس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا غلط استعمال کیا جائے تو دنیا میں بھی برے نتائج پیدا ہوتے ہیں اس نے اپنے بندوں کے لئے احکام و ہدایات کا جو مجموعہ "القرآن" نازل فرمایا ہے، جو بیک وقت آئین بندگی بھی ہے اور آئین جہاں بانی بھی، اور جس کو قبول و اختیار کرنا ہی اس رب اعلیٰ و عظیم کی بندگی کا شرف حاصل کرنا ہے۔ ایسے لازوال با اختیار حاکم کو بندوں کے اعمال کا صلہ و جزاء دینے پر قادر نہ سمجھنا اور جزائے اعمال کے لئے ایک غیر محدود و غیر فانی عالم کے موجود ہونے کا انکار کرنا ذہن انسانی کی جاہلانہ حرکت اور قلبِ انسانی کا ایک مہلک مرض ہے۔

حق تعالیٰ کی فرماں روائی و حکومت حقیقی ہے، لافانی و غیر محدود ہے وہ جو صلہ اور جزاء دیتا ہے وہ ابدی اور غیر محدود ہے، یہ محدود عالم جو انسان کی سعی و عمل کا مقام ہے، غیر محدود صلہ و جزاء کا مقام نہیں ہوسکتا۔ ایک غیر محدود و لافانی عالم جزاء کی تخلیق اللہ کی لازوال حکومت کے لئے یقینی و برحق ہے، حیاتِ بعد الموت کے وہ حقائق جو واحد الہٰی کتاب "القرآن" کے سوا کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہیں، جب تک انسان ان کو تسلیم نہ کرے گا، اللہ کو رب و الٰہ واحد ماننے اور اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے صحیح نظام فکر و عمل، دین اسلام کو سمجھنے اور اس کو قبول و اختیار کرنے کی قابلیت اس میں پیدا نہ ہوگی اور قلبِ انسانی ہمیشہ مخالفت ہی پر آمادہ رہے گا اور حدودِ عبدیت سے باہر ہوکر سفرِ حیات کو طے کرنے کے لئے اپنے آپ کو اپنے مالک و حاکمِ حقیقی سے بے نیاز سمجھتا رہے گا، جس کی تعبیر کبر سے کی گئی ہے۔

الٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ

(اے بنی آدم) تمہارا الٰہ (مالک و حاکم، معبود و مستعان) ایک ہی الٰہ ہے پس جو لوگ حیاتِ آخرہ پر یقین نہیں رکھتے ان

کے قلوب (فطری دعوت) کے منکر ہیں اور وہ اپنے رب سے تکبر کرتے ہیں۔

اللہ کی مالکیت کو حاکمیت اور عالم جزا کی صداقت و حقیقت کو سمجھ کر انسان جب قبول و اختیار کر لیتا ہے، تو اس کا اقتضاء یہی ہے کہ وہ نہ نفس و شیطان کی اتباع کو پسند کرتا ہے اور نہ کسی انسان کی تابعداری و غلامی اور بہ تعلق نفع و ضرر کسی کے آگے سرنگوں ہونے کو گوارا کرتا ہے، وہ اولاً نفس و شیطان کی اتباع سے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین عزیز و اقارب، دوست احباب کو علماً و عملاً آزاد رکھنے کی امکانی کوشش کرتا رہے گا اور تمام ان قوتوں کے مقابلہ و مقاطعہ کا عزم و حوصلہ اس میں پیدا ہو جائیگا جو اس خوش گوار فرض کی انجام دہی میں مانع و مزاحم ہوتی ہیں، نفس و شیطان کے تسلط سے آزاد ہونے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اعمال ظاہری سے متعلق جو احکام الٰہی ہیں ان پر عامل ہو جائے، بلکہ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ قلب میں مخلوق کا خوف نہ ہو مخلوق پر اعتماد نہ ہو، سعی و عمل میں بدل آخرت ملحوظ رہے، پرسش اعمال کا خیال ہر موقعہ پر دامن گیر رہے، قضاء و قدر کے ظہور پر جبین بہ جبین نہ ہو، اس پر اعتراض نہ ہو۔ اس کا اظہار بطور شکوہ و شکایت نہ ہو، اللہ ہی سے وابستگی و گرویدگی رہے اور کوئی حرکت اقرار ربوبیت کے خلاف نہ ہو۔ کیونکہ یہ تمام امور اس عہد عبدیت و بندگی کے منافی ہیں۔ جو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے، اور جو در اصل دین و ایمان و اخلاص کی موت ہے۔ نفس و شیطان کے تسلط سے آزاد ہوتے ہی فطری حریت و آزادی کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں، باد مخالف کے جھونکے جن کو فرو نہیں کر سکتے، بلکہ اور تیز کر دیتے ہیں، یہ ہے وہ اسلامی سیاسی بیداری اور سیاسی شعور جس کو رو بہ عمل لانے کے آغاز ہی میں انسان دانشمند و مدبر، نیک نفس، پاک باطن، وسیع النظر، منکسر المزاج، سلیم الطبع، بے لوث، جری و بلند حوصلہ بنا دیا جاتا ہے، اس میں کم و بیش وہ تمام صفات پیدا ہو جاتے ہیں، جو انسانیت کا

ھر ہ اتصاف ہیں، اور اس کی انفرادی و اجتماعی، منزلی و تمدنی زندگی میں عدل و احسان کا جذبہ کار فرما ہو جاتا ہے، کیونکہ عبد کو رب و مولا نے یہی تاکید فرمائی ہے۔

ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان (النحل)

(ترجمہ) بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم فرماتے ہیں۔

جس سیاست کی بنیاد عدل و احسان پر ہو اس کو اس سیاست د سیاسی بیداری سے کیا مناسبت ہے، جس کا مقصود فطرت کے خلاف صرف دنیا ہی دنیا ہے اور جس کی بنیاد ظلم و تعدی، مکر و فریب، زر و دولت و عددی برتری ہے، جو اجسام کو طوق و زنجیر میں جکڑ سکتی ہے، مگر قلوب کو اپنا گرویدہ نہیں بنا سکتی، سروں کو اپنے آگے جھکا سکتی ہے، مگر دلوں کو نہیں جھکا سکتی، اجسام پر حکومت کر سکتی ہے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتی اس سے ظاہری شان و شوکت تو حاصل ہو سکتی ہے مگر حق و صداقت کی طاقت، اس کا رعب و دبدبہ نہیں حاصل ہو سکتا۔ افترائی ادیان کے پیرو مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ سمجھنے پر مجبور ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی الہٰی کتاب نہیں ہے، مگر دین اسلام کے جو پیرو ہیں ان کے نزدیک دین ہی سیاست ہے، افسوس کہ ناقص تعلیمات کی وجہ سے دین کے اس حقیقی و جامع مفہوم سے دماغ آشنا نہیں رہے، جن کا دماغ اس نور الہٰی سے روشن نہیں ہے، وہ اپنے فطری جذبۂ سیاست کا غلط استعمال کر کے امن و سلامتی کی پاک دنیا آباد کرنے کے بجائے فتنہ و فساد کی ناپاک دنیا کو آباد کرتے ہیں نہ اُن کو منزلی زندگی میں آسودگی و راحت نصیب ہوتی ہے اور نہ اُن کی مدنی زندگی خوش گوار ہوتی ہے، ان کے سینے میں ایک آگ سی لگی رہے گی، جس سے اُن کے دل و دماغ جلتے بھُنتے رہیں گے، جو دراصل آگ نہیں ہے بلکہ اُس کرۂ نار کا عکس ہے، جو حدود عبدیت و انسانیت سے متجاوز ہونیوالوں کا آخری ٹھکانہ ہے

تصریحاتِ صدر سے واضح ہو گا کہ دین اسلام کا پیرو بشرطیکہ اس نے دین کی صحیح تعلیم حاصل کی ہو اپنے اسلامی افکار و خیالات، اعمال و کردار کے لحاظ سے نظامِ اسلام کے سوا کسی اور نظام کی محکومیّت کو بطیبِ خاطر برداشت نہیں کر سکتا۔ دین اسلام کو قبول و اختیار کرنے کا اقتضاء یہی ہے کہ ہر ظلمت کو نور سے، ہر ناپاکی کو پاکی سے، اور ہر باطل کو حق سے بدل دینے کی کوشش، سخنے، قدمے، درمے، زندگی کا اولین فریضہ ہو جائے، دین کی صحیح تعلیم حاصل کر کے اس کے اصول و فروع پر حتی الامکان عامل ہو جانا اور جلوت و خلوت میں، گھر میں مجالس میں ان ہی خیالات کا اظہار کرتے رہنا، اپنے متعلقین اور اہل و عیال کے دل و دماغ کو اسی نور سے منور کرتے رہنا، باطل کو حق سے، ظلمت کو نور سے بدلنے کا فرض انجام دینا ہے، اور یہی طریقہ، طریقہ مصطفویؐ ہے، اس کے خلاف جو اقدام بھی کیا جائیگا، وہ خلافِ پیغمبر ہونے کی وجہ سے خیر و برکات کا حامل نہ ہو گا۔

اس سلسلہ میں یہ گذارش بھی گوش گذار کی جاتی ہے کہ دین فطرت خالص علمی و تحقیقی دین ہے، ہر بالغ عاقل مرد پر فرض ہے کہ اس کو سمجھ بوجھ کر قبول و اختیار کرے، انسان کو سمع و بصر و فؤاد کی قوتیں دینِ فطرت ہی کو قبول و اختیار کرنے کے لئے دی گئی ہیں۔ دیگر علوم و فنون حاصل کرنے کی اجازت دراصل دین ہی کے حصول واس کے اغراض و مقاصد کے لئے ہے، دیگر علوم و فنون کی طرح دین بھی ایک مستقل فن ہے، اس لئے یہ فن بھی بغیر کسی ماہر فن کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کا وہ کونسا علم ہے جو محض اس فن کی کتابیں پڑھنے سے حاصل ہو جاتا ہے، جب تک اس کو کسی فن دان سے حاصل نہ کیا جائے، دین کا ماہر وہی ہے جو اس کے کلمۂ دعوتی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا ماہر ہے۔

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

(اقبالؒ)

وہ قلندری جس کے مضمرات میں دوجہان کی بادشاہی ہے اسی کلمہ کی تاثیر ہے۔ اس کلمہ کے علوم وحقائق سے واقف ہونے کے لئے کونوا مع الصادقین (اہل حق و صداقت کی صحبت اختیار کرو) کی تاکید بھی فرمائی گئی، اور یہی سنت الٰہی سنت نبوی سنت صحابہؓ ہے۔ اگر محض ادب وانشا کی قوت سے دین کے احیاء وتجدید کو فطرت انسانی قبول کرسکتی تو صرف کتاب نازل کردی جاتی، تزکیہ نفس وقلب کیلئے نہ معلم کتاب وحکمت مبعوث فرمائے جاتے اور نہ آپ کے سچے متبعین ہر زمانہ میں پیدا کئے جاتے اس فن کو کسی ماہر سے حاصل کیے بغیر دل ودماغ میں وہ روشنی پیدا نہیں ہوسکتی، جس سے زندگی کا ہر تاریک گوشہ روشن ہوجاتا ہے، اور نہ اسلام کی صحیح نمایندگی کرنے کی قابلیت پیدا ہوسکتی ہے جو زندگی کا اوّلین فریضہ ہے اور نہ باطل کو مغلوب کرنے کا عزم وحوصلہ پیدا ہوسکتا ہے جو اسلامی سیاسی شعور ہے اور نہ وہ ایمانی توانائی پیدا ہوسکتی ہے، جو پیرو اسلام کی سیاسی قوت ہے جس کے آگے سر جھکے ہوئے نہیں ہوتے ہیں' دل جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ جو غریبوں کے لئے سایۂ عاطفت ہے تو سرکشوں کے لئے تیغ بے نیام۔

جس غیر فطری سیاسی شعور وبیداری پر آج انسان فخر کررہا ہے اور فتنہ وفساد کی دنیا آباد کئے ہوئے ہے وہ بہت بڑا شیطانی فریب ہے جس میں انسان دانستہ یانادانستہ مبتلا ہے۔ فطری سیاسی بیداری یہ ہے کہ ہم رب ومولا کے عبد ومملوک ومحکوم بن کر اس کے نافرمان بندوں پر حکومت کریں، یہی انسانی زندگی ہے، اس کو ترک کرکے رب ومولا سے منہ موڑ کر اگر کچھ دنیاوی ترقی واقتدار حاصل بھی ہوجائے تو زندگی نہیں' موت ہے عزت نہیں ذلت ہے، دانش مندی نہیں بے عقلی ہے شرافت نہیں تحقیر انسانیت ہے، دین فطرت کی تعلیمات میں غیر فطری افکار یا بالفاظ دیگر الٰہی تعلیمات میں باطل افکار کی آتنی آمیزش ہوگئی ہے کہ اسلامی دنیا بھی مسلم کے قرآنی مفہوم سے ناآشنا ہوگئی۔

قَالَ اَسْلَمْتُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مسلم کا قرآنی مفہوم

مسلم الٰہی خطاب ہے۔ شاہی خطاب ہے، پروردگارِ عالم، فرماں روائے ارض وسما دنیا و آخرت کے حقیقی مالک وحاکم نے اُن بندوں کو اس خطاب سے سرفراز فرمایا جنہوں نے نورِ علم حق سے اپنے دل و دماغ کو منوّر کیا اور اپنے اعمال و کردار کی ظلمتوں کو اس نور سے دور کر کے اپنی زندگیوں میں نورانیت پیدا کی تھی، انقیاد و اطاعتِ حق ان کی زندگی کی امتیازی شان رہی۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے حوالے اور سپرد کر دیا۔ حکم و ہدایتِ حق کی اتباع ان کی روش رہی اور تسلیم و رضا ان کا شیوہ۔ اسی لئے بارگاہِ رب العزت سے ان کو وہی خطاب عطا کیا گیا جو نام ہی سے اپنے مسمیٰ کے امتیازی وصف کو نمایاں کرتا ہے۔

هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (الحج ع ۱۰)

(ترجمہ) اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا۔

اس لحاظ سے "مسلم" وہ ہے جو علم و ہدایت حق کے سوا نہ کچھ جانتا ہے نہ سوچتا ہے اور نہ کچھ کرتا ہے، زمانہ کی کروٹیں، دنیا کے انقلابات و حوادث نت نئی صورتیں اختیار کریں۔ زندگی کے نئے نئے نظریے اور مقاصد سامنے آئیں مگر "مسلم" اپنا وہی مقصدِ حیات رکھتا ہے جو حیات آفریں نے مقرر کر دیا ہے اور اس کے وہی فرائض زندگی ہوتے ہیں جو زندگی عطا کرنے والے نے متعین کر دیئے ہیں۔ اسی مقصدِ حیات کی اشاعت اور ان ہی فرائض زندگی کا نفاذ اس کی زندگی کا اوّلین فریضہ ہوتا ہے جب علم و مسلک، علم و ہدایت حق کے منافی و مغایر اس کے سامنے پیش کیا جائے اگرچہ

پورے دباؤ و قوت کے ساتھ پیش کیا جائے وہ اس کو بلا لحاظ لومۃ لائم اور بلا لحاظ ضرر جان و مال ٹھکرا دیتا ہے۔ علم و ہدایت حق کے خلاف مسلک و روش رکھنے والوں کی وقعت اس کی نظر میں مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہوتی، چاہے وہ مشرق و مغرب کے اربابِ حل و عقد ہی کیوں نہ ہوں اور دنیا ان کو امام الفکر کیوں نہ مانتی ہو۔ بلکہ ان غیر فطری باطل مسلک و روش رکھنے والوں کے متعلق "مسلم" کی دانش وہی ہوتی ہے جو دانش حق ہے۔

اولٰئک کالانعام بل ھم اضلّ (الاعراف)

(ترجمہ) یہ لوگ چوپایہ کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر

ایک پلا ہوا جانور اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور اس کے اشاروں پر چلتا ہے جو انسان اپنے خالق و رب کو نہ پہچانے اور اُس کے نازل کئے ہوئے علم و ہدایت کے تحت زندگی بسر نہ کرے اور خالق و رب کے مقرر کردہ فرائضِ حیات سے منحرف ہو اور پرمسرت حیات ابدی کے فطری مطالبہ کو فراموش کر کے صرف اسی شہوات و لذات و ہویٰ و ہوس کی زندگی کو مقصود و مطلوب بنائے اور انجامِ آخرت سے بالکل غافل رہے۔ وہ یقیناً جانور سے بھی بدتر ہے۔ عام ازیں کہ وہ ایک عظیم الشان سلطنت کا بادشاہ یا بڑی جمہوریت کا صدر ہو یا تحقیق و انکشاف کا طغرائے امتیاز اس کے پاس ہو۔ ان لوگوں کے افکار و تخیلات سے ایک مسلم اپنے دل و دماغ کو صرف علمِ حق کے نور سے منور رکھنے والا نہ متاثر ہوتا ہے اور نہ مرعوب، گو بظاہر وہ افکار و تخیلات کتنے ہی اعلیٰ اور خوش نما معلوم ہوتے ہوں۔ اسی بناء پر شاید اقبالؒ نے مسلم کی تعریف میں کہا ہے۔ ع

گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

یعنی مسلم اپنی گفتار و کردار سے جس مجلس میں جاتا ہے جس بزم میں شریک ہوتا ہے جس ماحول میں رہتا ہے یہی اعلان کرتا ہے کہ تمام انسان اللہ جل شانہٗ کے بندے

ہیں۔ بندوں کی صلاح و فلاح اسی میں ہے کہ وہ اللہ جل شانہٗ کے علم و ہدایت کے تحت زندگی بسر کریں۔ سب انسان ایک ہی اللہ بزرگ و برتر ہمہ دان و ہمہ خبیر کے بندے ہونے کی وجہ سے بلالحاظِ ملک و نسل و قوم ان سب کی زندگی سراپا بندگیِ حق ہونا چاہیئے اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز نسلی و ملکی و قومی خطوط پر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ بندگیٔ حق اور بندگیٔ نفس شیطان کی بنا پر ہونا چاہیئے، تمام انسانوں کو ایک ہی رشتۂ اخوت و محبت میں جوڑنے کا یہی واحد الٰہی طریقہ ہے۔ فطرتِ انسانی اس کی مقتضی ہے۔ آج انسانیت اسی آبحیات کی پیاسی ہے۔ عقل انسانی اندھی ہے اگر وہ علم حق کی روشنی سے محروم ہو، علمِ حق کا محتاج ہو کر اگر انسان اس سے اعراض و انحراف کریگا تو جہل و ظلمت ہی کی گھاٹیوں میں مدۃ العمر ٹھوکریں کھاتا رہیگا، اور اس کو کوئی روشنی نصیب نہ ہوگی خالقِ انسان، خالق فطرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ

ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور (النور ۵)

(ترجمہ) اور جس کو اللہ ہی نور ہدایت نہ دے اس کو کہیں بھی نور میسر نہیں ہوسکتا

اور یہ بھی اعلان حق ہے کہ علم حق کے نور سے آراستہ اور جہل کی تاریکیوں میں رہنے والے برابر نہیں ہوسکتے۔ علو و برتری، وقار و عزت ان ہی کے لئے ہے جو علمِ حق، ہدایت حق کے نور سے آراستہ ہیں

او من کان میتاً فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمٰت لیس بخارجٍ منھا (الانعام - ۶ - ۱۵)

(ترجمہ) ایسا شخص جو پہلے مردہ تھا پس ہم نے اس کو زندہ کیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے کیا اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو تاریکیوں میں ہے ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا

آیت کریمہ میں مسلم کی یہی شان بیان کی گئی ہے کہ وہ فکری و نظری و عملی حیثیت سے دیگر تمام انسانوں، جہل کی تاریکیوں میں رہنے والے انسانوں کے مقابلہ میں ایک اعلیٰ

وبرتر مقام رکھتا ہے۔ "یمشی بہ فی الناس" وہ نورِ ہدایت کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے وہ ظلمت کو ظلمت اور نور کو نور کہنے میں کوئی باک نہیں رکھتا اور ایک دلیل وبرہان ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا کہ انسان بندۂ حق ہے۔ بندۂ حق کی زندگی سرتاپا مرضئ حق ہونی چاہیئے، اس طرح علماً وعملاً وہ داعی الی الحق ہوتا ہے۔ مسلم کی یہی شان وتمکنت، اس کی یہی فطری حریت اہل باطل کو مرعوب کردیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس کا یہ حقیقی اعلیٰ وبلند نظریۂ حیات ہو کہ موت اختتام حیات نہیں ہے بلکہ حیاتِ ابدی کا آغاز ہے اس نظریۂ حیات کو اختیار کرکے دنیا کے تمام مفاد از قسم تعیش وتکلف کو خیرباد کہتا ہے اور ہمہ خیر ابدی زندگی اور وہاں کے درجات کو مطلوب ومقصود بناکر اسی جدوجہد میں مصروف ہو، ایسے بلند تخیل اور پاکیزہ کردار رکھنے والے شخص سے ان تمام انسانوں کا مرعوب ہونا بھی ایک قدرتی امر ہے جو یہ بلند نظریۂ حیات نہیں رکھتے، اور دنیا ہی کو مقصود ومطلوب بناکر لذات وشہوات اور سیم وزر کے بندے بنے ہوئے ہیں۔

غیر اقوام کے مفکرین جنہوں نے اسلام کو اپنی فطرت کے آئینہ میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ مسلمان مصنفین کی تصانیف اور شعراء کے شاعرانہ تخیلات اور مسلمانوں کی بگڑی ہوئی دینی حالت اور ان کی زندگی کے غیر اسلامی طور وطریق کے آئینے میں جو کچھ دیکھا اسی کو "اسلام" سمجھا، وہ اگر یہ کہنے کی جرأت کریں کہ "گیتا" بھی ویسے ہی اللہ کی کتاب ہے، جیسے قرآن ہے، جو اسلام "گیتا" میں ہے وہی قرآن میں نظر آتا ہے تو یہ ان نادانوں کا کیا قصور؟ مسلمانوں کی وہ جماعت جو اسلام کی نمایندگی کی مدعی ہے اسلام کی نمایندگی کچھ اس طرح غیر قرآنی انداز سے کررہی ہے، کہ اسلام کی عظمت وتفوق اور برتری کے جو نمایاں خط وخال ہیں، اس سے دنیا اور ہمسایہ قوم روشناس ہی نہ ہوسکی۔ صدیوں سے دین اسلام کے دعوتی کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وہ خالص تعلیم رائج نہیں ہے۔ جس میں عبدیت کا شعور وادراک ہے، خشیت الٰہی ہے،

حب الٰہی ہے، محبت کی والہانہ سرفروشی ہے، انقلاب کی اٹھتی امنگیں ہیں، جہاد فی سبیل اللہ یعنی دین پر استقامت اور دین کی اشاعت کا شوق و ولولہ ہے، عزائم کی بلندی ہے، ارادوں کی پختگی ہے، رضائے حق کے لئے ایثار و قربانی ہے، فراست ایمانی ہے، جرأت و بے باکی ہے، قلب کی صفائی ہے، نفس کا تزکیہ ہے، فکر و عمل میں تغیر ہے، مقصود و مطلوب کا انقلاب ہے، کامل ہوشیاری اور کامل بیداری ہے، اس کے برخلاف روایات کی بے جا اور کورانہ تقلید ہے۔ صرف روایات پر اعتماد ہے، جمود و تعطل ہے، غفلت اور بے حسی ہے۔ دین کے اصول و حقائق سے بے بصری، حق کے اثبات اور باطل کے ابطال کی قابلیت مفقود، منطقی حجت کے استاذ قرآنی حجت سے غافل۔ قرآنی حقائق کو فطرتِ انسانی پر منطبق کرنے کی صلاحیت کا فقدان، دین حق کے حامل مگر دین کی حقیقت سے ناواقف، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت کے خلاف جو بے باکانہ اقدام کیا جا رہا ہے اس کے ذمہ دار ہم ہیں اور صرف ہم۔ ؎

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

مسلمان، یہ نام ہی ظاہر کر رہا ہے کہ اس کے مسمیٰ کا کوئی تعلق کسی خطۂ زمین ہندوستان، ایران، ترک، ایشیا، یورپ سے نہیں ہے اور کوئی شخصی یا خاندانی تعلق جیسے یہودی یا پارسی وغیرہ بھی لفظ مسلم سے ظاہر نہیں ہوتا، اور نہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک انسان دوسرے دنیاوی جاہ و اقتدار رکھنے والے انسان کے تعلق سے کوئی شرف و عزت رکھتا ہے۔ "مسلم" کہنے سے کسی ادنیٰ، سفلی نسبت کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا یہ نام صراحتاً اپنے مسمیٰ کے اس وقار و شرافت اور بزرگی کو نمایاں کر رہا ہے کہ صرف رب عز و جل سے بندگی و احتیاج کا فطری تعلق اس کے لئے باعث فخر و شرف ہے

کفٰی لی فخرا انی لک عبدٌ وکفٰی لی شی فا انک لی رب

(ترجمہ) میرے لئے یہ فخر کافی ہے کہ میں تیرا غلام ہوں اور یہ شرف کافی ہے کہ تو میرا رب ہے

اس کے سوا وہ کسی مخلوقات ارضی وسماوی سے بندگی و احتیاج کا فطری تعلق نہیں رکھتا۔ خالق ورب ہی اس کی فطری غیر محدود آرزوؤں وتمناؤں، ایثار، قربانی اور فطری جذبات خوف ومحبت واعتماد وتسلیم ورضا، اطاعت وانقیاد کا واحد مرکز اعلیٰ وعظیم ہے، اور یہ کہ تمام انسانوں میں صرف ایک ذات گرامی ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علماً وعملاً جن کی اتباع کرکے وہ مرکز اعلیٰ وعظیم سے وابستہ رہتا ہے۔

علم ہی دراصل وہ اعلیٰ درجہ کی صفت ہے، جس سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت حاصل ہوتی ہے مدارج علمی کے لحاظ سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر جو فوقیت ہے، وہ کسی دلیل وبرہان کی محتاج نہیں، جو علم انسان کو بندگی حق پر قائم رکھتا ہے۔ اور انسان کو انسانیت کے اوصاف عدل واحسان سے مزین کرتا ہے اور زندگی کو حیوانی نہیں انسانی زندگی بناتا ہے، جس علم سے انسان کو شرف وبزرگی حاصل ہوتی ہے، اور جو انسان کے لئے مفید ہی مفید ہے ظاہر ہے کہ وہ خالق انسان ہمہ دان وہمہ خبیر ہی کا عطا کیا ہوا علم ہو سکتا ہے، اللہ جل شانہ کی عظمت وکبریائی کے لحاظ سے اُن کا عطا کردہ علم بھی قابل عظمت واحترام ہے اور جو انسان اس علم کا حامل ہوتا ہے اور اسی نور علم سے اپنے دل ودماغ کو روشن رکھتا ہے جس کی بصیرت اسی نور سے منور رہے وہی انسان تمام انسانوں کے مقابلہ میں عزت ووقار کا مستحق ہوتا ہے چنانچہ مسلم کو اسی وجہ سے دنیا میں ایک بلند مقام اور اقوام عالم کی رہبری کا منصب عطا کیا جاتا ہے کہ وہ صرف قرآن وسنت کے ذخیرۂ علمی کو اپنی زندگی کا بے بہا مایۂ عزو ناز سرمایہ سمجھتا ہے، اور بہر صورت بہر حال اسی کا پابند رہنا اس کے لئے باعثِ فخر ہوتا ہے، علم حق کی ناقدری کا نتیجہ ظاہر ہے کہ نسلی وقومی وملکی غیر فطری نظریہ اختیار کرکے مسلمان اور دیگر اقوام نہ صرف شرور وآفات میں مبتلا ہیں۔ بلکہ انسانیت سے کوسوں دور ہوگئے ہیں، اور ہوتے جارہے ہیں، دنیا برائے دنیا کا

غیر فطری ہفدانہ تخیل ہی دل و دماغ پر مسلط ہے، اور یہی تخیل انسانیت کے لئے، انسانی برادری کے لئے زہر قاتل ہے، اور اخروی زندگی کی تباہی و نامرادی اس کے قدرتی نتائج ہیں۔ واقعہ عرض کرتا ہوں کہ انسانیت اور اسلام ہم معنی الفاظ ہیں انسانیت یہی ہے کہ انسان کی مطلوب و مقصود آخرت کی بامراد زندگی ہو اور اس زندگی کو حاصل کرنیکے جو قدرتی ذرائع ہیں وہی انسان کا مسلک و روش رہے اور یہی اسلام ہے۔ اسلام پوری انسانی برادری کا مذہب ہے علماً و عملاً جو اسلام کا نمایندہ اور پیرو ہے، وہ مسلمان ہے، عام ازیں کہ وہ کسی ملک و نسل و قوم کا انسان ہو

الحاصل مسلم صاحبِ تسبیح و مصلیٰ ہی نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ ہنگامہ ہوتا ہے۔ وہ اللہ جلّ شانہٗ کے رب و حاکمِ حقیقی، کارساز، کارفرما، فرمانروائے دوجہاں ہونے کا ایک سرتاپا قدآدم چلتا پھرتا اشتہار ہوتا ہے، وہ اہل حق کیلئے ریشم کی طرح نرم ہوتا ہے تو مخالف حق کے لئے تیغِ بُرّاں۔ مخالف حق ہر فرد یا جماعت سے وہ حریفانہ کشمکش رکھتا ہے۔ اور اس کشمکش سے گریز کرنے کو وہ قابل ملامت کمزوری سمجھتا ہے۔ باطل کی ہزار ہنگامہ آرائی اس کو اپنے مقام سے نہیں ہٹا سکتی۔ اس کی ہر فکر، ہر نظر، باطل کے لئے کاری ضرب ہوتی ہے، وہ بے تیغ و سنان مرد غازی ہوتا ہے۔ مرکبِ ایام رہنا اس کی حمیّتِ ایمانی اور غیرتِ دینی کے خلاف ہے۔ اس کا جذبہ دینی اس کو راکبِ ایام رکھتا ہے۔ وہ حق کا دیوانہ ہوتا ہے، اس کی دشمنی و دوستی اللہ ہی کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے دل میں صرف اللہ جلّ شانہٗ کا خوف رہتا ہے۔ کسی اور کا خوف نہیں رہتا۔ اس کی گفتگو نرم اور دلآویز ہوتی ہے اور قاہرانہ اس کا کردار، حق گوئی و حق بینی اس کا شعار۔

ام تقولون علی اللہ ما لا تعلمون

الٰہی تعلیمات میں باطل افکار کی آمیزش

دین اسلام کی تکمیل یعنی نعمتِ الٰہی کا اتمام جب ہو چکا اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے تو حضرات صحابۂ کرامؓ کا بابرکت دور شروع ہوا جو سب سے زیادہ دعوتِ حق، مرضیِ رب، منشاءِ رسالت کو سمجھتے تھے۔ ان حضرات نے یکے بعد دیگرے خلافت کا فریضہ انجام دیا، اور دنیا کو انسانیت یا اسلام سے روشناس کیا یہ حضرات حضرت معلّم کتاب صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص تلامذہ تھے ان کے دل و دماغ صرف تعلیماتِ نبویؐ سے منوّر تھے، کتاب و سنت کے واضح اور صریح حکم و ہدایت کے سوا اور اس کے صحیح منشا اور مفہوم سے ہٹ کر نہ کچھ سمجھنا چاہتے تھے، نہ سوچنا۔ آیاتِ قرآنی اور ارشاداتِ نبوت کے سوا ان کے گوش حقیقت نیوش کسی اور آواز سے آشنا نہیں تھے انفس و آفاق میں آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے تھے، اور اسی پر ایمان و یقین رکھتے تھے اعتصام کتاب و سنت کا یہ عالم تھا کہ کتابِ الٰہی میں صریح و واضح حکم موجود ہو تو اس کے خلاف کوئی حدیث قبول کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہ ہوتے اور رسالت سے وابستگی کی یہ کیفیت تھی منشاءِ رسالت کے خلاف کسی کی رائے و مشورے کو ہرگز قبول نہیں کرتے تھے، مصلحتِ وقت کو بہانہ بنا کر کبھی کسی حکم و ہدایت کے خلاف عمل نہیں کیا، ان کی قوّت و یقین کا سرچشمہ صرف ارشاداتِ خدا و رسول تھے، ان ارشادات کی بنا پر وہ جن امورِ غیبیہ پر ایمان لائے تھے، ان کو کالمشاہدہ سمجھتے تھے۔ اس لئے ان کے قلوب میں نہ کشف و کرامت کا کوئی مطالبہ پیدا ہوا اور نہ وہ حضرات اس طرف مائل ہوئے اور

نہ کبھی کسی حکم وہدایت و امورِ غیبیہ کو اپنی ذاتی رائے وعقل سے جانچنے کی کوشش کی وہ الہٰی اور نبوی تعلیمات کو ہی عقل کی روشنی اور عقل کا رہبر سمجھتے تھے، کیونکہ تمام تعلیمات وہی تھے جو فطرتِ انسانی ہے اور جو انسان کے داعیات و مطالبات ہیں، یہ مبارک و مسعود دور ختم ہوگیا۔ دنیائے اسلام رفتہ رفتہ مشکوٰۃ نبوت کے پروانوں سے خالی ہوتی گئی اور کتاب و سنت سے ربط و تعلق کمزور ہوتا گیا، اسلام میں عجمی قومیں اپنے تصوّرات کو لے کر داخل ہوئیں، اِس وقت جو الہٰی تعلیمات مسلمانوں میں رائج ہیں، عام ازیں کہ ان کا تعلق دین سے ہو یا کمال دین سے ان میں باطل افکار کی بہت کچھ آمیزش ہے،

تمدن، تصوف، شریعت، کلام   بتانِ عجم کے پجاری تمام (اقبالؒ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین کی حقانیت و نورانیت پر ایک پردہ سا پڑا ہوا ہے مثلاً

باطل افکار	الہٰی قرآنی تعلیمات
۱۔ دین ایک ذمہ داری ہے جو اللہ نے بندوں پر عاید کی ہے اس غلط تصوّر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین کو ایک گرانی اور بوجھ سمجھا جاتا ہے اور کم سے کم ذمہ داری قبول کرنے کے لئے مختلف حیلے تراشے جاتے ہیں۔	۱۔ دین کے متعلق قرآنی اور فطری تصوّر یہ ہے کہ وہ فطرت انسانی ہے یعنی دین کے تمام احکام و ہدایات جو علم و عمل کا مجموعہ ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کی جزا، جس کا تعلق انسان کی عارضی اور ابدی زندگی سے ہے فطرتِ انسانی کے مطالبات ہیں۔ اور اس سے روگرداں ہونے کا بدل وہ تکلیف دہ نتائج ہیں جن سے انسانی فطرت فراری ہے

	اس فطری تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دین کو سمجھ جانے کے بعد بذوق وشوق "عرضِ متاعِ عقل و دل وجاں کئے ہوئے" قبول و اختیار کرتا ہے، اور زیانِ جان و مال سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ہم عہد دین کے مقابلہ میں مسابقت کا فطری جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، جن قرآنی آیات سے فرض و ذمہ داری کا تصور پیدا ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان امور کی انجام دہی کے بغیر انسان کے فطری مطالبات کی تکمیل نہیں ہو سکتی، انسان رحمتِ حق کا مستحق نہیں ہو سکتا، انسان رحمتِ حق کا محتاج ہے اور رحمتِ حق کی طلب ہر انسان کی فطری خواہش ہے۔
۲۔ بندگی، بیچارگی اور بے بسی کا نام ہے۔ یعنی انسان جو چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا (حالانکہ ہر آن تحت حکمت انسان کی حاجت روائی فرمائی جارہی ہے اور حکمت کا تعلق انسان ہی کے مفاد سے ہے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے)۔	۲۔ بندگی غلامی اور محتاجی کا نام ہے غلامی اور احتیاج کی نسبت حقیقی مالک و حاجت روا سے قائم ہو جائے تو بیچارگی و بے بسی نہیں رہتی بلکہ فطری حریت و آزادی حاصل ہو جاتی ہے جو ایک بندہ کا فطری مطالبہ ہے۔
۳۔ دنیا علیحدہ ہے اور دین علیحدہ ہے	۳۔ احکام و ہدایتِ حق کے تحت دنیا میں

زندگی بسر کرنا ہی دین ہے، بالفاظ دیگر
خالق ومخلوق کے حقوق جو خالق فطرت نے
متعین کر دیئے ہیں ان کو کما حقہ، مشکوٰۃ نبوت
کی روشنی میں ادا کرتے رہنا جس میں خود انسان
کے نفس کے حقوق بھی شامل ہیں دین ہے
یہی انسانی زندگی ہے اور آخرت کی ابدی
زندگی کی تعمیر کا واحد ذریعہ ہے، اس لحاظ
سے دنیا اسلام کی نظر میں مزرعۃ الآخرۃ ہے
یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو تو دنیا اُخروی
زندگی کی تباہی کا ذریعہ ہے لہٰذا اس حقیقت
کو فراموش کر دینا یا اس سے روگردان
ہو جانا نادانی ہے جہل ہے اور یہی وہ دنیا
ہے جو ملعون ہے۔

۴۔ نجاتِ اُخروی کسی نہ کسی طریقہ سے
نار سے بچ جانا ہے یا چھوٹ جانا کافی ہے
نیز ایک اور تصور یہ بھی قائم ہو گیا ہے کہ
عالمِ آخرت ایک روحانی عالم ہے جسمانی
نہیں اس لئے وہاں جسمانی مطالبات از
قسم اکل و شرب و لباس و میلانات جنسی
نہ ہونگے۔ اگر ہونگے تو بھی مثالی و خیالی
طور پر ہوں گے۔

۴۔ قرآنی تصور آخرت کے متعلق یہ ہے
کہ وہ ایک مستقل زندگی ہے، اُس زندگی
میں بڑے بڑے درجات اور ارفع و اعلیٰ
فضائل ہیں۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ
درجات اور فضیلت کا حاصل کرنا اگر
امکان میں ہو تو ضرور اس کے حصول کے
لئے ممکنہ جدوجہد کرتا ہے، گویا اُخروی
زندگی ہی حقیقی اور ابدی زندگی ہے اور

زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی خواہش اور اس کی تکمیل کے لیے ممکنہ جدوجہد انسان کی فطرت ہے۔ صحتِ علم یعنی تصحیح و تجدیدِ ایمان اور صحتِ عمل کے بغیر آخرت کی بامرادی اور درجات و فضائل کا حصول ممکن نہیں عالمِ آخرت محض روحانی عالم نہیں ہے بلکہ ایک جسمانی عالم ہے اس عالم میں اجسام خاکی ہیں۔ اس عالم جنت میں نورانی ہونگے اس لحاظ سے وہاں کا سامان زندگی بھی نورانی ہوگا، اکل و شرب و لباس اور جنسی میلانات کے بالکل ایسے ہی جذبات ہونگے، دراصل روحانیت جس کا نام ہے اس کا صحیح مفہوم شاید ان حضرات نے سمجھا نہیں، عالمِ آخرت 'روحانی عالم ہونے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ اُس عالم میں انسان اپنے خواہشات کی تکمیل میں اسباب کا تابع اور پابند نہ ہوگا، بلکہ اس کے مطالبات اس کے ارادہ کے ساتھ تکمیل پائیں گے۔

۵۔ انسان میں غضبی، شہوانی جو قوتیں ہیں اور اکل و شرب و لباس و میلانات

۵۔ قرآنی تصور یہ ہے کہ یہ انسانی خصائل ہیں جو بالکلیہ اس کے فطری ہیں

جنسی کے جو جذبات ہیں وہ بہیمانہ صفات وخصائل ہیں:

بقائے حیات کے لئے اور فرائض حیات کی انجام دہی کے لئے ناگزیر ہیں، مثلاً کہا جاتا ہے کہ غصہ و عداوت بہیمیت ہے حالانکہ باطل کی سرکوبی کے لئے اگر ان صفات سے انسان متصف نہ کیا جاتا، تو وہ حق و باطل کے معرکہ میں کامیاب نہ ہوتا، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان متضاد جذبات کا حامل ہے، مثلاً محبت بھی اس میں ہے اور عداوت بھی، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو مستحق محبت ہے حُب کا جذبہ اس سے متعلق رہے، اور جو مستحقِ عداوت ہے، اُس سے تحت عدل عداوت کا جذبہ متعلق رہے، حق مستحق حُب ہے، اور باطل مستحق عداوت۔ اس لئے دین اسلام میں کسی فطری جذبہ کو فنا کرنے کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ ان کے استعمال کا رُخ صحیح کر دیا گیا ہے اسلام کے دین فطرت، دینِ حق ہونے کا یہی واضح اور ناقابلِ تردید ثبوت ہے اس میں فطری جذبات کو استعمال کرنے کا صحیح طریقہ بتلایا گیا ہے، اور انسان کو اس

حقیقی مطالبات، داعیات سے واقف کرایا گیا ہے۔ جن لوگوں نے دین کو اس عنوان سے نہیں سمجھا، انہوں نے اپنی تعلیمات میں فنائے جذبات پر زور دیا اس طرح فطری تعلیم میں غیر فطری عناصر شامل ہو گئے اور نتیجتاً ترک علائق و گوشہ نشینی کا رجحان دینداروں میں پیدا ہو گیا، جو جوگیت اور رہبانیت کی ایک قسم ہے جس کی وجہ سے مردانِ زاہد، اہل رخصت تو پیدا ہوتے گئے، مگر مردانِ مجاہد، صاحبانِ عزیمت کا قحط پڑھتا گیا، اور خلافت کا وہ فطری و قرآنی تصور باقی نہیں رہا، جو انسان کا اصلی منصب ہے، اور جو عبدیت سے متحقق ہونے کے بعد حاصل ہوتا ہے

۶۔ عبادت! عبد و رب کا ایک قلبی و فطری تعلق ہے، سب سے بڑی عبادت اس تعلق میں حسن و کمال پیدا کرنا ہے۔ جس کے بعد صحیح خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ صحیح خدمت خلق یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ سے بچھڑے ہوئے، اللہ جلّ شانہٗ کو بھولے ہوئے بندوں کو اللہ

۶۔ عبادت! عبادت عبد و رب کا ایک قانونی تعلق ہے اور سب سے بڑی عبادت خدمتِ خلق ہے۔

۷ ۔ ولایت کا مفہوم: امورِ غیبیہ نظر آنا ، پوشیدہ باتوں پر اطلاع پانا ، خدا کی یاد میں اس قدر گم رہنا کہ دنیا و مافیہا سے بے تعلق ہوجائے ، ہر صورت میں اللہ ہی کے وجود و صفات کا مشاہدہ کرنا ، یعنی یہ سمجھنا کہ ہر صورت میں اللہ ہی ظاہر ہے اللہ تعالیٰ ہی مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہیں ، امراض کو اپنی توجہ سے سلب کرنا ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

... سے وابستہ ، اللہ کا گرویدہ بنانے کی جدّوجہد قرآنی طریقہ پر کی جائے ۔ تاکہ انسان کی اخروی زندگی بہتر ہو جائے ، جس کے ضمن میں یہ عارضی زندگی بھی درست ہوجاتی ہے اور اسی مقصد کے تحت ان کے ساتھ ہر قسم کی ہمدردی کیجائے۔

۷ ۔ ولایت یہ ہے کہ خدا سے اس قدر گرویدگی و شیفتگی پیدا ہوجائے کہ زندگی سراپا مرضیِ حق ہوجائے اور مرضیِ حق ہی کی اتباع میں تمام تکلفات ، مرغوبات و مقصودات سے قطع نظر کرلیں ، بلا لحاظ لومۃ لائم و ضررِ جان و مال اعلائے کلمۃ الحق زندگی کا اولین فریضہ اور محبوب ترین مشغلہ ہوجائے اپنے حدود امکانی میں مرضیِ حق کو نافذ کرنے میں کوئی رعایت و کوتاہی نہ کریں ، باطل اور باطل کے پرستاروں سے کوئی دوستی و لگاؤ نہ ہو نہ ان کی عظمت ہو نہ مرعوبیت ، البتہ ان کو مریض سمجھ کر ان کی اصلاح کی طرف مائل رہے اور اسی مقصد کے تحت ان کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آئے ۔ زندگی کی ہر حرکت و سکون کو اللہ ہی کی رحمت و توجہ و فضل و احسان سمجھیے اور انفس

	وآفاق میں آیاتِ الٰہی ونعمائے الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ہر وقت منعم کے شکر اور منعم کی یاد میں رہنا امراض قلبی ونفسی پہ مطلع کیا جانا اور اللہ جل شانہ کا شاہد ونگران ہونا کالمشاہدہ ہو جانا۔
۸۔ کلام الٰہی کو وہی حضرات خوب سمجھتے ہیں جو زبانِ عرب، صرف ونحو اور فلسفہ ومنطق کے ماہر ہیں۔	۸۔ کلام الٰہی کا مقصد مراد الٰہی کو پانا ہے تاکہ بندے مراد الٰہی کی اتباع کرکے اپنی دنیا وآخرت کی مرادیں حاصل کرنے کے مستحق ہو جائیں کلام الٰہی سے کیا مراد الٰہی ہے؟ اُن ہی بندوں کو اطلاع بخشی جاتی ہے۔ جو کلمہ طیبہ سے مراد الٰہی کو سمجھ کر اس کو اپنی مراد بنا لیتے ہیں اور احتیاج علمی کی نسبت علیم ہی سے قائم رکھتے ہیں نہ کہ دیگر حضرات کے ارشادات وتصانیف سے۔ زبان دانی اور مختلف علوم سے واقفیت لازمی شرط نہیں۔
۹۔ معاشی اصلاح کے بغیر دین وایمان کی اصلاح ممکن نہیں دنیا مقدم ہے آخرت مؤخر ہے۔	۹۔ دین وآخرت مقدم ہے۔ دین وایمان کی اصلاح کے بعد معاشی بے فکری بھی حاصل ہو جاتی ہے، اور رزاق حقیقی کی طرف سے معاشی فراغت کے اسباب بھی فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔

۱۰۔ کتاب و سنت کے علاوہ اور طریقوں سے بھی وہی تعلق باللہ، نسبتِ الٰہیہ قائم ہو سکتی ہے جو صحابہ کرام کو حاصل تھی اسی بنا پر سلوک مروجہ میں مختلف اشغال و مراقبات ایسے رائج ہیں جن کی تعلیم نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو دی اور نہ خود صحابہ نے کوئی طریقہ ایجاد کیا۔	۱۰۔ تعلق باللہ یا نسبتِ الٰہیہ حاصل کرنے کا صرف ایک ہی مؤثر طریقہ نماز ثابت ہے۔ صحابۂ کرام کے پاس نسبتِ الٰہیہ قائم کرنے کا نماز ہی ذریعہ تھا، یہی شغل تھا، اور اسی کی اہمیت تھی۔ کتاب و سنت کے سوا اگر کسی اور طریقہ سے نسبت حاصل کی جائے، تو فکری اور نظری حیثیت سے کتاب و سنت سے کامل توافق نہیں رہتا اور اعتصام کتاب و سنت کی فضیلت باقی نہیں رہتی، نہ اس سے وہ آثار اور خیر و برکات حاصل ہوتے ہیں جو صحابہ کرامؓ کو حاصل تھے اور نہ جہاد فی سبیل اللہ کا وہ فطری جذبہ بیدار ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ اور نہ ایثار و عزیمت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے جو صحابہ کرام کو حاصل تھا۔
۱۱۔ دین مشکل ہے، اس کے بعض مسائل پیچیدہ ہیں۔	۱۱۔ دین آسان ہے، کوئی مسئلہ پیچیدہ نہیں ہے۔
۱۲۔ بزرگانِ دین، شیخ طریقت کی ہر بات ہر قول قابلِ اتباع ہے۔ ان سے غلطی کا امکان نہیں۔ ان سے اختلاف سوءِ ادبی	۱۲۔ بزرگانِ دین، اولیاء اللہ سے تعبیری و اجتہادی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان کے احترام کو ملحوظ رکھ کر ان سے اعتصام کتاب و سنت

ہے۔	کے تعلق سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ ان کے مسلمات کی بنیاد کشف ہو۔ یہ اختلاف نہ ان کی سوءِ ادبی ہے اور اور نہ تحقیر۔ اولیاء اللہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ "جو کچھ وہ فرماتے ہیں مطابق کتاب و سنت ہی ہوتا ہے، کتاب و سنت کی کسوٹی پر اس کو پرکھنے کی ضرورت نہیں" شخصیت پرستی کی ایک قسم ہے۔
۱۳۔ مسئلہ تقدیر سے قوائے عملی میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے اس سے جمود و پستی پیدا ہوتی ہے۔	۱۳۔ تقدیر کے قرآنی مفہوم سے قوائے عملی میں حرکت اور دل و دماغ میں توانائی و بیداری پیدا ہوتی ہے۔
۱۴۔ رسالت محمدیہ ﷺ کا اتباع دیگر اقوام کے لئے ضروری نہیں ہے۔	۱۴۔ جب دینِ فطرت تمام بنی آدم کا دین ہے تو اس کا ایک عملی نمونہ "اسوۂ حسنہ" بھی تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے۔ اتباع رسالت کے بغیر کسی شخص کے لئے چاہے وہ کسی قوم و ملک کا ہو دنیا و آخرت کی فلاح ممکن نہیں۔
۱۵۔ شریعت الگ ہے اور محبت الگ ہے۔	۱۵۔ شریعت محبت ہی کا مظاہرہ ہے اور محبت ہی کی ہنگامہ آرائی ہے۔ ظاہراً و باطناً کامل اتباع شریعت ہی حقیقی محبت ہے شریعت کی اصل محبت ہی ہے

دین کی غیر صحیح تعلیمات یا صحیح تعلیمات کے غیر صحیح مفہومات جو صدیوں سے روایتاً مسلمانوں میں چلے آرہے ہیں اور جن پر مسلمان عامل ہیں ان کو دیکھ کر غیر اقوام کے مفکرین یہ آوازیں بلند کر رہے ہیں کہ اسلام اور دیگر مذاہب میں کوئی فرق نہیں، جو اسلام قرآن میں ہے وہی گیتا میں ہے، اور تائید میں مسلمان شعراء کے اشعار کو پیش کیا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) در حیرتم کہ دشمنیٔ کفر و دین چراست ٭ از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

ایک ہی چراغ ہے جس کی نورانیت سے کعبہ و بت خانہ روشن ہے تو پھر کفر و دین کا فرق اور اس فرق کی وجہ سے عداوت نہ ہونی چاہیئے۔

خدا کی پناہ دین حق کا کتنا غیر صحیح مفہوم اور اس کی کتنی غلط تفہیم۔

(۲) اگر کافر ز بت آگاہ گشتے ٭ یکے از سالکان راہ گشتے

کافر اگر بت کی حقیقت سے آگاہ ہوتا، یعنی اگر وہ یہ جانتا، کہ بت کی صورت میں بھی اللہ ہی کا جلوہ ہے تو وہ راہِ توحید کا ایک راہ رو ہوتا۔

(۳) مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست ٭ یقیں کردے کہ دیں در بت پرستیست

مسلمان اگر اس حقیقت سے واقف ہوتے کہ بت کی صورت میں اللہ جلوہ گر ہے تو بت پرستی کو بھی دین سمجھتے۔

آیاتِ قرآنی کی کتنی غلط تعبیر!

"ہر صورت میں ذاتِ حق ہی جلوہ فرما ہے، معلوم کی صورت میں عالم ہی موجود ہے یہ حقیقت جب منکشف ہوجائے، تو بت کو سجدہ نہیں اللہ ہی کو سجدہ کیا جاتا ہے۔ اب استعانت غیر اللہ سے نہیں، اللہ ہی سے ہے، اللہ کو سجدہ کرنا، اللہ سے استعانت، مخالف شریعت نہیں ہے۔"

کیا معقول تعلیم ہے، اور کیا معقول منطق ہے، باطل اسی ہتھیار سے آج دین و ایمان پر ضربیں لگا رہا ہے۔

دین، شریعت میں جو غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے شرک ہے غیر اللہ سے استعانت حرام ہے، شرک ہے، اس کی حقیقت یہی ہے کہ مخلوقات کی صورت میں اللہ تعالیٰ جلوہ گر نہیں ہے، یعنی مخلوقات کی صورت میں وجود حق و توابعاتِ وجود (صفات حق) نہیں ہیں۔ موجوداتِ عالم اپنی ہستی و بقاء میں ہر آن اللہ جلشانہٗ کے محتاج ہونے کی تحقیق یہ نہیں ہے کہ اللہ جل شانہ' ان کی صورت میں موجود ہے اور نہ یہ حقیقت ہے، کہ مخلوقات میں جو وجود و صفات ہیں، وہ اللہ جل شانہ' کے اصلی صفات ہیں، یہ عرفانِ حق نہیں ہے، وہم و گمان ہے، ہوش کی باتیں نہیں، بیہوشی کی باتیں ہیں۔ یہ بیداری کی باتیں نہیں، خواب کی باتیں ہیں۔ تو ہی تو ہے یا "تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم" کا نعرہ غلبۂ شوق و محبت کی ایک والہانہ صدا ہے نہ کہ حقیقتِ نفس الامری، مگر خدا پناہ میں رکھے ایسے غلبۂ عشق سے جو زندقہ و الحاد کی نہروں کا سرچشمہ ہو۔ یہ غیر قرآنی افکار و تصورات۔

"لا الٰہ الا اللہ اور لا معبود الا اللہ کی حقیقت

لا موجود الا اللہ، عبدیت کا عروج الوہیت ہے

اور الوہیت کا نزول عبدیت ہے، وجوداً خالق و مخلوق ایک۔"

جب دل و دماغ پر مسلط ہو جاتے ہیں، تو "یا اللہ" یا اللہ کے بجائے "یا فلاں یا فلاں" کو توحید سمجھا جاتا ہے، اور اس سے منع کر کے اتباع کتاب و سنت کی طرف بلانے والے ظالم و مردود قرار دیئے جاتے ہیں۔ بعض حضرات صوفیاء نے اس اختلاف کو دور کرنے کی جو کوشش فرمائی ہے، وہ یہ ہے:۔

"یا فلاں ایک مرتبہ میں شرک ہے اور ایک مرتبہ میں توحید ہے۔

غیر خدا کی بندگی ایک مرتبہ میں شرک ہے اور ایک مرتبہ میں توحید

مخلوق ایک مرتبہ میں غیر حق ہے ایک مرتبہ میں عین حق۔ مراتب کا

"فرق شریعت حقہ سے ایک اعلیٰ مقام ہے۔"

آج اسی اعلیٰ مقام کو اہلِ باطل اپنا مورچہ بنا کر دین و ایمان پر حملہ کر رہے ہیں۔ شریعتِ حقہ سے ایک اعلیٰ مقام ذہن انسانی کی پیداوار ہے، قرآنی تعلیم نہیں، صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تاکید فرمائی جا رہی ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الجاثیہ)

(ترجمہ) پھر ہم نے آپ کو شریعت کے طریقہ پر قائم کر دیا پس آپ اسی کی اتباع کیجئے اور ان جہلا کی خواہش پر نہ چلیئے

شریعت کے سوا جو کچھ ہے وہ "اھواء الذین لا یعلمون" ہے صاحبِ شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات میں ایک مرتبہ میں توحید اور ایک مرتبہ میں شرک کی تعلیم نظر نہیں آتی، قرآن کریم کو شروع سے آخر تک بغور پڑھیئے، ایسا کوئی ال اور علم جو ایک مرتبہ میں شرک اور ایک مرتبہ میں توحید ہو اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ قرآنی و انبیائی تعلیم یہی ہے کہ جو خیال و عمل مرتبۂ صالحیت میں شرک ہے، وہی مرتبۂ شہادت میں بھی شرک ہے اور مرتبۂ صدیقیت (قرب) میں بھی شرک ہے شریعت کی ابتدا یعنی توحید کی تعلیم جب تک صحیح نہ ہو شرک کا مفہوم صحیح نہیں ہو سکتا۔ اور ایک مرتبہ میں شرک اور ایک مرتبہ میں توحید کی بھول بھلیاں سے انسان نہیں نکل سکتا، رفع اثنینیت (دوئی کو مٹانا) توحید کا نہ صحیح مفہوم ہے اور نہ قرآنی و انبیائی تعلیم ہے اور نہ خالق و مخلوق کا وجوداً ایک ہونا قرآنی توحید ہے۔

دینِ فطرت

فہرست

۱	فطرت کا تعین اور اسکا حقیقی مطالبہ	۵۹
۲	حیاتِ انسانی کا اول و آخر	۶۱
۳	الدین الواصب	۶۶
۴	صالحیت ۔ کلمہ طیبہ ۔	۶۷
	شرک	۶۸
	کفر	۷۵
	نفاق	۷۶
	ایمان باللہ	۷۹
۵	جذبات کی تشریح ۔ خوف و رجا ۔	۸۵
	شکر ۔	۸۶
	صبر و رضا	۸۸
	محبت	۹۳
	رحمانیت کی اجمالی تشریح	۹۶
	ذکر ۔	۱۰۱
	توکل	۱۰۵
	طلب امداد و دعا ۔	۱۰۶
	اطاعت و انقیاد ۔	۱۰۹
	نماز	۱۱۱
	زکوٰۃ	۱۱۲
	روزہ	۱۱۳
	حج	۱۱۴
	توبہ و استغفار	۱۱۵
	قانون مغفرت	۱۱۷
۶	شہادت	۱۲۰
۷	عرفانِ مروجہ پر ایک نظر	۱۲۵
	محکمات و متشابہات	۱۴۴
	قرآن فہمی کا اصول ۔	۱۶۱
	آیات قرب و معیت و احادیث کا مطلب	۱۶۱
	تخلیق انسانی اور نزول قرآن کا مقصد ۔	۲۰۱
۸	صدیقیت یا قرب (احسان)	۲۱۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

دینِ فطرت

فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم

(ترجمہ) انسان کی جو فطرت ہے وہ اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے، اللہ کی پیدا کی ہوئی چیز بدل نہیں سکتی یہی سیدھا دین ہے۔

"دین قیم" کا مطلب یہ ہے کہ یہی وہ دین ہے جو انسان کو اس کی فطرت پر قائم رکھتا ہے۔ فطرت کو سمجھنے کے بعد دین کا سمجھنا آسان ہو جاتا ہے اور دین کے اصولی علم کو سمجھنے میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا۔

فطرت کا تعین اور اسکا حقیقی مطالبہ

(۱) انسان کی وہ پیدائشی حالت اور وہ امور جو تمام بنی آدم میں مشترکاً بلا لحاظ ملک و قوم و نسل پائے جاتے ہیں۔ مثلاً پیدائش و موت، بچپن، لڑکپن، شباب و بڑھاپے کے دور سے گزرنا، اعضاء و جوارح سے وہی کام لینا جس کام کے لئے وہ بنائے گئے ہیں۔

(۲) انسان کے وہ تمام خواہشات، احساسات، مطالبات جن کا تعلق اس کی عارضی و ابدی زندگی سے ہے مثلاً بقائے حیات اور قیامِ زندگی کے لئے اکل و شرب، لباس کی خواہش، جنسی رجحانات و میلانات، شادی و غم کے احساسات، انس و محبت، غضب و عداوت کے جذبات، خوف، شکر، اطاعت و سرافگندگی، تقلید و اتباع، سعی و عمل کا فطری ملکہ، جزائے سعی و عمل، امن و سلامتی اور ابنائے جنس کے مقابلہ

ہیں تفوق و برتری کی خواہش اور ابدی زندگی کے تمام فطری مطالبات یعنی اپنے خالق و رب سے ملنے کا شوق، حیاتِ دوام، شباب دوام، عیش دوام، مطلق العنانی وغیرہ انسان کی یہی پیدائشی حالت اس کی فطرت ہے، جس کے تغیر و تبدل پر، جس کے پیدا کرنے و فنا کرنے پر انسان کو دسترس نہیں ہے، زمین کی تقسیم اور مرز و بوم کے اختلافات کی وجہ سے قومی و لسانی فرق و امتیاز پیدا ہوا رسم و رواج اور ماحول کے اثرات سے عادات اور معاشرت کے طور و طریق بھی مختلف ہوئے مگر ایک چیز فطرت مشترک رہی۔ اس کی وحدت میں کوئی فرق نہ آیا، تمدن و معاشرت، علوم و فنون کے زوال و کمال اور ان کے ارتقار کی مختلف صورتیں پیدا ہوئیں، مگر یہ تمام تغیرات فطرتِ انسانی کو نہ بدل سکے فطرت اور مقتضیاتِ فطرت کی وحدت ناقابلِ تغیر رہی ؛ فطرت کی یکسانیت اپنی جگہ قائم اور اٹل ہے اور یہی نہیں بلکہ ابتدائے آفرینش سے فطری جذبات و احساسات اور قوائے دماغی و جسمانی کو حرکت میں لانے والے محرکات و داعیات بھی ایک ہی ہیں۔ انسان کی جسم و صورت اور فطری جذبات کی ساخت و پرداخت کی وحدت تجربہ و مشاہدہ ہے کہ ایک ہی اٹل نظامِ رحمت سے وابستہ ہے جس کے خلاف انسان نہ کوئی حرکت کر سکتا ہے اور نہ جس کی اتباع و پابندی کے بغیر انسان کی کوئی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ انسان کی یہی فطری حیثیت گواہی دے رہی ہے کہ ایک ہی اعلیٰ اور قادر، رحمٰن و رحیم، علیم و حکیم ہستی انسان کی خالق ہے، رب ہے اور اس پر نگران و حاکم ہے، اور انسان اپنے خالق ہی کا بندہ، یعنی مملوک و محکوم اور محتاج ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اور انسان کا رواں رواں اسی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ انسان اپنے فطری جذبات کی تربیت، عارضی و ابدی زندگی کے فطری مطالبات کی تکمیل میں صرف اپنے خالق و رب کے احکام و ہدایات کا محتاج ہے اس احتیاجی نسبت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے فطری ملکۂ اطاعت و انقیاد، طلب و سوال اور فطری جذبات خوف و شکر و حبّ وغیرہ کا تعلق بھی اسی ذاتِ ربِ اعلیٰ و عظیم سے قائم رکھے، اسی کے احکام و

ہدایات کے تحت زندگی بسر کرے، تاکہ عارضی و ابدی زندگی، خوف و حزن سے محفوظ رہے اور ابدی پرمسرت و بامراد زندگی اس کو حاصل ہو، خالقِ فطرت نے اپنی رحمت سے دینِ فطرت نازل فرماکر انسان کے اسی فطری تقاضہ کو پورا کیا، پس دینِ اسلام فطرتِ انسانی کا مطالبہ ہے،

فطرتِ انسانی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اس باطل تخیل کی بالکلیہ نفی ہوجاتی ہے کہ "مختلف ملک و قوم و نسل کے انسان جو مختلف ادیان و مذاہب کے حامل ہیں وہ تمام برحق ہیں"۔ جب یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام انسان ایک ذات ربِ اعلیٰ و عظیم کے بندے ہیں۔ فطری امور، فطری جذبات و مطالبات سب میں مشترک ہیں۔ تو پھر اُن کا آئین بندگی، جذباتِ فطری کی تربیت اور مطالباتِ فطرت کی تکمیل کا نظام بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اور یہی امر واقعہ ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (القرآن)

خالقِ فطرت کے اس ارشاد کا مطلب یہی ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے صرف دینِ اسلام ہی نازل فرمایا، بندوں کے لئے یہی وہ طریقۂ زندگی ہے جس میں از سرتا پا بندگیٔ حق ہے، تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری ہے تاکہ انسان کی یہ عارضی زندگی حیاتِ طیبہ ہوجائے، یعنی ظلم و شر، حق تلفی، خواہشات کی بہیمانہ اتباع، بہیمانہ خصائل اور فتنہ و فساد سے پاک کردی جائے اور اس جدّ و جہد کے معاوضہ میں ابدی زندگی، ابدی نعمتوں "عیشۃ راضیۃ" سے بندے سرفراز کئے جائیں، یہی فطرتِ انسانی کا حقیقی و باطنی مطالبہ ہے،

حیاتِ انسانی کا اوّل و آخر

حیاتِ انسانی کے متعلق دینِ فطرت میں وہی حقائق بیان کئے گئے ہیں جو انسان کے تجربہ مشاہدہ میں ہیں اور جس کے مصداقات فطرتِ انسانی میں موجود ہیں، انسان زندگی کے جس دور سے گزر رہا ہے ظاہر ہے کہ

یہ عارضی اور چند روزہ ہے ، خالقِ فطرت کی ہدایت ہے کہ یہ حقیقت ہر وقت ذہن نشین رہے

لکم فی الارض مستقرٌ ومتاعٌ الیٰ حین	زمین میں تمہارے لئے چند روز ہی ٹھیرنا اور تمتع حاصل کرنا ہے۔

زندگی کا چند روزہ ہونا تو سب ہی جانتے ہیں ان الفاظ میں صرف یہی بات ظاہر نہیں فرمائی گئی ہے بلکہ اشارہ اس جانب ہے کہ یہ انقلابات وحوادث کا عالم ہے یہاں کسی چیز کو قرار و ثبات نہیں ہے ، مال واولاد وزن زمین ، راحت وشادمانی ، فراغت وعافیت بھی آتی جاتی ہیں ، اور مشکلات ومصائب ، حیرانی وپریشانی ، دکھ بیماری ، حزن وغم ، فقر وفاقہ بھی آتی جاتی ہے ۔ ان فانی چیزوں سے نہ دل لگاوے اور نہ ان کے ہاتھ آنے سے فخر وغرور پیدا ہو ، اور ان کے ضائع ہوجانے سے ان فانی مصائب سے نہ دلگیر رہنا چاہیئے ، ذہن نشین رہے کہ اللہ جل شانہٗ کے ارشاد کا مخاطب بندہ ہے ، جس کا فریضۂ حیات بندگی وخلافت ہے دنیا کی دلچسپیوں میں ، زینت وآرائش میں ، عیش وعشرت میں ، ذخائر سیم وزر میں ' اگر اس کا دل اٹکا رہے گا اور دنیا کے حوادث وانقلابات ' تغیرات میں حیران وپریشان رہے گا تو فرائض سے غافل ہوکر منزلِ مقصود کو بھلا دیگا ۔ حُبّ دنیا جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوکر اپنی زندگی کو حیوانی زندگی بنا لے گا ، ان فطری حقوق وواجبات کو فراموش کردے گا جو فطری تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے پر عاید ہوتے ہیں اور جن کی ذمہ داری کا احساس ہر شخص کی فطرت میں ہے ، اور یہی فطری احساس انسان کو صیانتِ حقوق اور تعزیرات کے قوانین وضع کرنے اور اس کی پابندی کرنے پر آمادہ کرتا ہے ۔ فطری حقوق وواجبات کی یہی بندشیں انسان کو اس حقیقت پر مطلع کر رہی ہیں کہ یہ چند روزہ زندگی اس کے لئے ایک امتحان اور آزمائش کا دور ہے ، اور یہی خالق فطرت کی تعلیم ہے ۔

الذی خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا (الملک)	جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں بہتر ہے ۔

انسانوں کو متنبہ کیا جارہا ہے ، کہ زندگی کا تمام سامانِ زیب وزینت تمہاری آزمائش و

امتحان کیلئے ہے تاکہ تم خالق و مخلوق کے حقوق و واجبات کو ادا کر کے اپنے کردار کا بہتر نمونہ پیش کرو۔

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم احسن عملا (الکہف)

ہم نے زمین پر چیزوں کو اسکے لئے باعثِ رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

ان ارشادات میں اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا ہے کہ سامانِ زندگی دل بہلانے کے لئے ہے دل لگانے کے لئے نہیں ہے، انسانوں کو چاہیئے کہ ان اسباب زینت سے دل بہلاتے رہیں اور فریضۂ حیات میں دل لگائے رکھیں یعنی بندگی حق پر قائم رہیں، صحیفۂ فطرت "القرآن" میں "حسنِ عمل" بندگی حق کی ایک اصطلاح ہے، علاوہ ازیں یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ زندگی گزارنے، دل بہلانے کا یہ سامان زینت و آرائش و زیبائش دراصل انسانکی سعی و جدّ و جہد کا بدل نہیں ہے۔ جو چیز امتحان و آزمائش کے لئے عطا کی جائے وہ امتحان میں کامیاب ہونے کا بدل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ رب اعلیٰ و عظیم کے پاس اس امتحان میں کامیاب ہونے یعنی "حسن عمل" بندگی حق کا جو بہتر بدل مقرر ہے وہی سزاوار تمنا ہے، حاصل کرنے کے قابل ہے، فطرت انسانی کا اصلی مطالبہ ہے۔

المال والبنون زینۃ الحیوٰۃ الدنیاؕ والبٰقیٰت الصّٰلحٰت خیر عند ربك ثوابا وخیر املا۔ (الکہف)

مال و اولاد حیاتِ دنیا کی ایک رونق ہے اور عمل صالح کا جو بدل تیرے رب کے پاس ہے وہی بہتر ہے باقی رہنے والا ہے اور اسی کی تمنا اچھی تمنا ہے۔

یہ ارشاد حق کہ "اللہ جل شانہٗ" کے پاس "اعمال صالحہ" نیکیوں کا باقی رہنے والا بدل ہے اس حقیقت کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ حیات آفریں کے پاس ایک عالم جزائے اعمال کا بھی ہے، چونکہ انسان کو اس کے اعمال کا بدل عطا کیا جائے گا، اس لئے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کا ایک ابدی لازوال عالم ہے یہی انسان کی حیاتِ آخرہ ہے ہر انسان کی فطرت میں ابدی زندگی کی خواہش ہے حیات آفریں کا ارشاد ہے کہ وہی زندگی حقیقی زندگی ہے۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (العنکبوت)	اور بے شک دار آخرت ہی حقیقی زندگی ہے۔

اسی ابدی عالم کو ثبات و قرار ہے۔

وان الاٰخرة هي دار القرار (المؤمن)	اور بے شک آخرت (کی زندگی ہی) کو قرار ہے۔

اس میں ایک دنیائے حسن و خوبی و رحمت و شادمانی ہے۔

حسنت مستقراً ومقاماً (الفرقان)	اچھا ٹھکانا اور اچھا مقام ہے۔

اور وہ صرف ایک اچھا مقام ہی نہیں ہے، بلکہ وہاں بھی بڑے بڑے درجات و فضائل ہیں۔

وللاٰخرة اکبر درجٰت واکبر تفضیلا (سبحان الذی)	اور بے شک آخرت میں بڑے درجات و بڑے فضائل ہیں۔

اور دوسرا عالم درد و اذیت ہے۔

وفی الاٰخرة عذابٌ شدیدٌ (الحدید)	اور آخرت میں عذاب شدید ہے۔

یہی دوسرا عالم نہایت بُرا مقام ہے۔

ساءت مستقراً ومقاماً (الفرقان)	بُرا ٹھکانا بُرا مقام ہے۔

عالمِ سرور و راحت بھی ابدی و غیر فانی ہے۔ وہاں کی نعمتوں کو بقائے دوام ہے۔

والاٰخرة خیر وابقٰی (سورہ الاعلیٰ)	آخرت کی زندگی بہتر و لازوال ہے۔

اور عالم درد و اذیت بھی شدید و غیر فانی ہے۔

ولعذاب الاٰخرة اشد وابقٰی (طٰهٰ)	آخرت کا عذاب شدید اور باقی رہنے والا ہے۔

آخرت کی خیر و ابقیٰ زندگی اُن ہی حضرات کو عطا کی جاتی ہے جو اس آزمائش و امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں، عارضی زندگی احکام و ہدایات رب کے تحت بسر کرتے ہیں جو اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں۔ جو احکام و ہدایاتِ رب کے خلاف کسی انسانی، غیر فطری علم و عمل کے تحت زندگی بسر کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

والآخرة خير لمن اتقى (نساء) — اور آخرت ان ہی کے لئے بہتر ہے جو پرہیزگار ہیں۔

اِس زندگی کے متعلق حضرت معلم کتاب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اللهم لا خير الا خير الآخرة — الٰہی نہیں ہے خیر مگر آخرت کا خیر۔

یعنی آخرت کا خیر، بھلائی، اصلی و حقیقی خیر ہے۔ انسان فطرۃً خیر کا طالب ہے اس کو وہی خیر طلب کرنا چاہیئے، جو حقیقی و اصلی ہے پائیدار ہے، اور ارشاد مبارک ہے۔

ان العيش عيش الآخرة — آخرت ہی کی زندگی اصلی زندگی ہے۔

وہ زندگی جو حقیقی زندگی ہے، بہتر و لازوال زندگی ہے۔ اس زندگی کے جو مطالبات انسان کی فطرت میں ہیں، دید و لقاء رب، قرب، عیش دوام، شباب دوام، راحت، نہ کوئی محنت نہ مشقت، نہ خوف و حزن، نہ کوئی فکر و ذمہ داری، یہ سب کچھ انسان کو عطا کیا جائے گا۔

لهم ما يشاءون عند ربهم (الزمر) — جو کچھ چاہیں گے ان کے رب کے پاس ان کے لئے موجود ہے۔

گویا اُخروی زندگی بالکلیہ ایسے انسان کے مرضی کے مطابق ہوگی، جو کامیابی کے ساتھ آزمائشی دورِ حیات کو ختم کرے۔

حیاتِ انسانی کے یہی دو رُخ اول و آخر، اوّل کو ظاہر اور آخر کو باطن بنا کر انسان کے سامنے پیش کئے گئے ہیں، اور اس کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ اعمال کا بدلہ اسی جہان میں حیاتِ دنیا میں چاہتا ہے۔ اور اسی عارضی زندگی کے اسباب زینت کو مطلوب بنا لیتا ہے تو اس کو اسی عالم میں نیکیوں کا بدل دے دیا جائے گا۔

من كان يريد الحيوة الدنيا وزينتها نوف اليهم اعمالهم وهم فيها لا يبخسون (هود)

جو اپنی نیکیوں سے محض دنیا کا نفع اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم نیکیوں کا بدل اس کو اسی جہاں میں پورا پورا دے دیتے ہیں اور کوئی کمی نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا ہی میں ان کی نیکیوں کا عوض شہرت و نیک نامی، فراخ عیش، کثرتِ اموال و اولاد، عطا کر دیا جاتا ہے، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی ظاہر کر دیا گیا کہ ان کی آخرت کی ابدی زندگی درد و اذیت، سوز و تپش کی زندگی ہوگی، کرۂ نار ان کا ٹھکانہ ہوگا۔

اولٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ۔ (ہود)	یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لئے آخرت میں بجز نار کے اور کچھ نہیں۔

فطری مطالبات کو نہ سمجھنے، مذہب انسانیت، دینِ حق کو قبول و اختیار نہ کرنے کا یہی قدرتی نتیجہ ہے۔ دینِ حق کا مفہوم یہی ہے کہ وہ طریقۂ زندگی، نظام حیات، آئین بندگی، دستورِ رحمت، جو خالق انسان جل شانہٗ نے انسانوں، اپنے بندوں کے لئے نازل فرمایا ہے، اور جس کو قبول و رد کرنے کے عارضی و ابدی ثمرات و نتائج ایسے ہی اٹل ہیں جیسے پانی کی برودت، یا آگ کی احتراقیت، پانی کی خاصیت پیاس کو بجھانا، اور آگ کی خاصیت جلانا، پانی اور آگ کی قدرتی خاصیت و اثر کو بجز اللہ کے کوئی فردِ خلق بدل نہیں سکتا، اس طرح دین حق کو قبول و رد کرنے کے عارضی و ابدی نتائج کو بدلنے کا اختیار کسی فردِ خلق کو نہیں۔ خالق انسان جل شانہٗ نے دینِ حق کو دین واصب فرمایا ہے۔

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا۔	اس (اللہ) ہی کی ملک ہیں سب چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں لازمی طور پر اطاعت اسی کا حق ہے۔

الدین الواصب کا مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں جو انسان کا سلسلہ حیات جاری رکھنے کے لئے باذنِ الٰہی اپنا اپنا کام کر رہی ہیں، ان کے آثار و خواص جو اللہ جل شانہٗ نے مقرر کر دیئے ہیں وہ اتنے لازمی اور اٹل ہیں کہ بجز خدا کے کوئی فردِ خلق اس کو بدلنے پر قادر نہیں ہے۔ انسان بھی چونکہ اللہ ہی کی ملک ہے۔ اپنی فلاح و خیر کے لئے اللہ ہی کے مقرر کئے ہوئے ضابطۂ حیات کی پابندی اس کے لئے ضروری ہے ورنہ خلاف ورزی کے عارضی و ابدی

نتائج و ثمرات سے دوچار ہونا لازمی ہے۔ "الدین الواصب" کا ایک مطلب تو یہ ہے اور دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے قوانینِ تعزیری اتنے سخت ہیں کہ نفس کی خباثت و شرارت اس کے بغیر دور نہیں ہو سکتی اور اخلاقی تربیت کا انداز اتنا موثر اور مزاج انسانی کے موافق ہے کہ اس کے بغیر انسان اوصاف انسانیت سے متصف نہیں ہو سکتا اور اس کے سوا کسی اور طریقۂ تعلیم و تربیت کو مزاجِ انسانی قبول نہیں کر سکتا اسلئے خالق انسان نے تنبیہ فرمادیا کہ

ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الاٰخرۃ من الخٰسرین (آل عمران)	جو شخص خدا کی فرماں برداری کے سوا کسی اور طریقۂ زندگی کو اختیار کریگا تو وہ اس سے قبول نہ کیا جائیگا اور وہ بلحاظ آخرت نقصان میں رہیگا۔

اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ دینِ اسلام یا دینِ حق یا دینِ فطرت کو خالق انسان نے اسلئے نازل فرمایا ہیکہ تمام بندے اس دینِ واحد کو قبول و اختیار کر کے عارضی و ابدی زندگی کے نقصانات سے محفوظ رہیں، اور ابدی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدو جہد کریں، عارضی زندگی میں عدل و احسان، امن و سلامتی اس کے مضمرات ہیں۔ اور یہی فطرتِ انسانی کے مطالبات ہیں۔

فطرت اور فطرت انسانی کے مطالبات اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد ہر طالبِ حق کی فطرتِ سلیمہ کا یہی فیصلہ ہوگا کہ دینِ حق کے سوا انسان کی نجات کا کوئی اور راستہ نہیں۔

صالحیت اکلمہ طیبہ انسان پاکیزہ و شائستہ و صالح نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی فطری حیثیت بندگی حق پر قائم نہ ہو جائے، صالح زندگی انسانی زندگی یعنی بندگی حق کا نقطۂ آغاز "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے۔ خالق انسان نے ایک برگزیدہ انسان محمد رسول اللہ کو کامل بندۂ حق بنا کر ان کی زبان حقیقت ترجمان سے اپنی حکومت و فرماں روائی کا اعلان فرما دیا، اپنے بندوں کی بقائے حیات کے لئے جس طرح ہوا، پانی غذا اور دیگر سامان زندگی کو پیدا فرمایا۔ اس طرح ایک کامل بندۂ حق کو پیدا فرما کر ان

کے ذریعہ اپنے فرماں روا و حاجت روا ہونے کا اعلان کر کے بندوں کی زندگی کو حیاتِ طیبۂ صالح زندگی بنانے کا سامان مہیا کر دیا ہے، غذا و پانی کی طرح ایک کامل بندۂ حق اور ان کا "اسوۂ حسنہ" خالق کائنات کی بادشاہی و حاجت روائی کا اعلان اور ایک آئینِ بندگی، دستورِ رحمت کا وجود انسانی دنیا کے لئے ناگزیر فطری مطالبات کی تکمیل کا اہم و مقدم سامانِ حیات ہے، بجا طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ فطرت انسانی کا مطالبہ ہے فطرت کی آواز ہے۔ اس کلمہ کا نام قرآن، صحیفۂ فطرت کی اصطلاح میں کلمۂ طیبہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان کے دل و دماغ کو غیر فطری افکار و تصورات اور انسان کی زندگی کو ناشائستہ، انسانیت سوز اعمال و کردار کی گندگیوں سے پاک کر دیتا ہے اور انسان کی زندگی کو انسانی زندگی، صالح، پاک زندگی بنا دیتا ہے۔ اس کلمہ کے الفاظ لاالٰہ سے اولاً باطل و غیر فطری افکار کی تردید کی گئی ہے۔ اور الا اللّٰہ سے عبد و رب کے فطری تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باطل و غیر فطری افکار کا نام قرآنی اصطلاح میں شرک، کفر و نفاق ہے۔ کلمۂ طیبہ پیامِ حق و صداقت کو سمجھ کر قبول کرنے کیلئے اوّلاً غیر فطری افکار، شرک، کفر، نفاق سے تائب ہونا ضروری ہے جب تک قلب کو ان گندگیوں سے بالکلیہ پاک نہ کر دیا جائے، قلب میں علمِ الٰہی کا فیضان جاری ہو کر نورِ ایمان جلوہ گر نہیں ہوتا۔

شرک علم و دانش حق کے خلاف علم و دانش رکھنا شرک ہے۔ انسان کی فطری حیثیت، اس کی زندگی اور عبد و رب کے فطری تعلق کے متعلق انسان کو علم کی جو روشنی بخشی گئی ہے اور جو حقائق بیان کئے گئے ہیں اس کے خلاف کسی بات کو حقیقت سمجھنا اور ماننا اور اسی کے تحت زندگی بسر کرنا شرک ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ :-

۱ ۔ اللہ جل شانہ کے سوا کسی مرئی یا غیر مرئی طاقت کو اللہ کی خالقیّت، ربوبیت، رزاقیت، مالکیّت، حاکمیّت، رحمانیت وغیرہ میں اللہ کے مقررہ نظام کائنات میں، اللہ کے اوامر و احکام میں دخیل و شریک سمجھنا یعنی وہ تمام اسماءِ حسنیٰ کتاب و سنت میں جن کی تفصیل درج ہے، ان اسمائے حسنیٰ میں سے کسی ایک اسم حسن کو بھی مخلوق کے لئے ثابت کرنا، افراد خلق کو ان اسمائے حسنیٰ سے متصف سمجھنا شرک ہے۔

۲ ۔ اللہ جل شانہ کو مخلوق کے صفات سے متصف سمجھنا شرک ہے۔

۳ ۔ موت و حیات، رزق و اولاد، دنیوی و اُخروی زندگی کا نفع و ضرر، ذلّت و عزت، منع و عطا، صحت و عافیّت، نزول مصائب و مشکلات ان کا دفعیہ، شرور و آفات سے حفاظت، ہدایت و ضلالت، فقر و غنیٰ، افلاس و تونگری، حاجت روائی و مشکل کشائی، ان تمام امور کا اختیار افراد خلق کے لئے ثابت کرنا شرک ہے۔ عام ازیں کہ وہ افراد خلق ملائکہ ہوں، اجنّہ ہوں، حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہوں، اولیاء کرام ہوں، یا سلاطین و بادشاہ ہوں۔

۴ ۔ انسان کا اپنے آپ کو اپنی زندگی کا مالک و مختار سمجھ کر من مانے انفرادی و اجتماعی زندگی کے کاروبار کو انجام دینا شرک ہے۔

۵ ۔ انسان کے وضع کردہ آئین و قوانین کو موجب فلاح و خیر سمجھنا، اور آئین و قوانین وضع کرنے کا اختیار انسان کے لئے ثابت کرنا۔

۶ ۔ سعی و جدوجہد اور فکر و تدبیر کے جو نتائج و ثمرات رونما ہوتے ہیں ان کو اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھنا۔

۷ ۔ شگونِ بد لینا، غیر اللہ کی قسم کھانا، نجومی کی باتوں کو سچ سمجھنا، حوادث و انقلابات اور موسمی تغیرات کو ستاروں کی گردش کا اثر سمجھنا، یہ سب شرک ہے۔

۸ - اللہ جل شانہٗ میں کوئی عیب یا نقص ثابت کرنا، جسم و صورت، حلول و اتحاد وغیرہ اللہ کے لئے ثابت کرنا، شرک ہے۔

۹ - دنیا و آخرت کا نفع و ضرر فقرہ ۳ میں جس کی صراحت ہے، اس کے تعلق سے افرادِ خلق میں سے کسی کو پکارنا، اور ان سے نذر و منت مانگنا۔ ان کے آگے سجدہ ریز ہونا، طواف کرنا۔ ان کے نام سے قربانی کرنا۔ ان کے آگے قیام کرنا اور ایسے طریقے اختیار کرنا جن سے فقر و ذلت کا اظہار ہوتا ہو شرک ہے۔

۱۰ - خوفِ الٰہی کے بجائے مخلوق کا خوف، حبِ الٰہی کے بجائے مخلوق کی محبت، اللہ جل شانہٗ پر اعتماد و بھروسہ کرنے کے بجائے مخلوق پر اعتماد و بھروسہ شرک ہے۔

۱۱ - مخلوق کے دکھاوے کے لئے یا امورِ دینیہ کو اس نیت سے انجام دینا کہ مخلوق سے اس کا بدل ملے شرک ہے۔ شرک کی یہ مختصر تفصیل آیتِ قرآنی

قل انما ھو الٰہ واحد واننی بریٔ مما تشرکون | کہہ دیجئے کہ صرف اللہ ہی معبود ہیں اور میں بیزار ہوں تمہارے شرک سے

کی تفسیر ہے۔

جب انسان دنیا و آخرت کے مشکلات و مصائب کا دفعیہ اپنی تدبیر و اختیار سے نہیں کر سکتا تو کسی ولی و کارساز کو تلاش کرتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ کی مخلوق ملائکہ و جن و انس حضرات انبیاء علیہم السلام و اولیائے کرام سے غیر طبعی امور اور معجزات و کرامات کا ظہور دیکھ کر ان کو اپنا مربی و شفیع و حاجت روا بنا لیتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے ان کو اپنی قدرت کا کچھ حصہ عطا فرمایا ہے، نظمِ عالم میں ان کو تصرف کا اختیار حاصل ہے۔ اور اللہ جل شانہٗ کے پاس ان کو اس قدر رسوخ و اعتماد بھی ہے کہ اللہ جل شانہٗ ان کی مرضی و منشاء کے موافق حکم صادر کر دیتے ہیں۔ ان کے ذریعہ اور واسطے کے بغیر اللہ جل شانہٗ تک نہ انسان کی رسائی ہوتی ہے اور نہ اس کے دعاؤں کی شنوائی، انسان دنیا میں من مانی زندگی گزار کر خدا کے مقبول بندوں

کو اگر راضی رکھے تو شدائد آخرت سے چھٹکارا بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اور دنیا کے دکھ اور حیرانی و پریشانی، رنج و الم سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے۔ دنیا و آخرت کی خوشحالی ان ہی کے دامن سے وابستہ رہنے میں ہے، یہ تمام تصورات شرک کی تعریف میں داخل ہیں۔ اس باطل خیال کے تحت اُن کو راضی رکھنے کے لئے ان کے مجسمے بنا کر یا اُن کے مزاروں پر نذر و منّت، قربانی، طواف، رکوع و سجود کے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے۔ دفعِ مصائب، حل مشکلات اور انجاح حاجات کے لئے ان ہی کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان کو مدد کے لئے پکارتا ہے۔ یہ تمام افعال عبادتِ غیر اللہ اور مشرکانہ اعمال ہیں۔ جن کے متعلق اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لا الٰہ الا ھو سبحٰنہٗ عما یشرکون۔ (التوبہ)

کیا تم اللہ کے سوا احبار اور رہبان کو اور مسیح ابن مریم کو رب بنا لیا حالانکہ تم کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ (اللہ) الٰہ واحد کی عبادت کرو کوئی الٰہ نہیں ہے سوائے اس کے وہ پاک ہے ان کے شرک سے۔

اس ارشاد میں ان تمام غلط و باطل تصوّرات کی کلیتاً تردید فرمائی گئی ہے جو جہل کی وجہ سے بزرگانِ دین، انبیاء علیہم السلام کے متعلق انسان قائم کر لیتا ہے۔ اور ان کو اللہ جل شانہٗ کی فرماں روائی اور حاجت روائی میں شریک سمجھ لیتا ہے۔ اور ان کے لئے بھی ربوبیت و الوہیت کو ثابت کرتا ہے۔ اور اللہ جل شانہ سے وابستہ رہنے کے بجائے اپنی گردن میں مخلوق کی غلامی کا طوق ڈال لیتا ہے اور فطری جذبۂ خدا پرستی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے حریّت و آزادی کا فطری جذبہ بیدار نہیں ہوتا، فطرتِ انسانی وحدت پسند ہے اگر انسان محکوم ہو تو اپنے حاکم کے سوا کسی غیر کی حکومت کو پسند نہیں کرتا اور اگر حاکم ہو تو اپنی حاکمیّت میں غیر کی شرکت کو گوارا نہیں کرتا۔ کوئی حکومت

اپنے اقتدار میں کسی غیر کی شرکت نہیں چاہتی اور کوئی رعیت بھی اپنی حکومت میں اغیار کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتی اور اپنے راعی کے اقتدار و تسلط کے سوا کسی اور کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتی، انسان کے اس عمل سے ثابت ہے کہ شرک مزاج انسانی کے مطابق نہیں، اور ایک ہی مرکز سے وابستہ رہنا اور اس کی اطاعت و فرماں برداری انسان کی فطرت ہے۔

تصریحاتِ صدر سے واضح ہے کہ فطری حیثیت عبدیت، احتیاج و اطاعت کی غیر صحیح نسبت یعنی افرادِ خلق سے نسبت عبدیت قائم کرنا شرک ہے۔ جو بالفاظ دیگر حق تعالیٰ سے متصادم ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ حقیقی مالک و حاکم سے بغاوت ہے۔ حقیقی حاجت روا کی ناقدری ہے۔ اسی لئے اس مخالفت و بغاوت و ناقدری کے جو عارضی و ابدی نتائج و ثمرات، صلہ و جزا خالقِ انسان نے مقرر کر دیا ہے۔ وہ بھی نہایت تکلیف دہ ہیں۔

(۱) عارضی زندگی میں شرک، مخالفتِ حق کا لازمی بدل نجاست و ناپاکی قرار دیا۔

انما المشرکون نجسٌ (التوبہ) شرک کرنے والے ناپاک ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ غیر فطری افکار کی گندگی کی وجہ سے ان کے اعمال و کردار میں بھی کوئی پاکیزگی نہیں رہ سکتی اور شرک کرنے والے کی زندگی حیوانوں کی طرح ایک ناپاک زندگی ہوگی۔ مثلاً کمزور و بے وسیلہ انسانوں کی حق تلفی، ظالموں کی حمایت، غارت گری و خونریزی، جان و مال، عزت و ناموس کی بربادی، جبر و استبداد، دغا و فریب، شرک کرنے والوں کی سیاست ہوگی، داعیاتِ ہوئٰ و نفس، اور لذاتِ و شہوات کی تکمیل کے غیر فطری ذرائع ان کی تہذیب کے بنیادی اصول ہونگے کھیل تماشا، نسلی و قومی تفاخر، کثرتِ مال و اولاد کی ہوس، جسم و صورت، لباس و مکان کی تزئین و آرائش ان کا مطلوب و مقصود۔ انجامِ آخرت سے بے غافل۔

اقوام گذشتہ کے واقعات تاریخ کے صفحات میں مندرج ہیں ؛ ان کی سیاست وتمدن کا یہی نقشہ رہا ؛ اس ترقی یافتہ روشن زمانہ میں بھی اللہ جل شانہٗ کے باغی اور نافرمان انسانوں کا جو دستورحیات ہے ؛ جو نظام حکومت ہے ، چاہے وہ سرمایہ دارانہ ہے یا جمہوری یا اشتراکی ، اس کے بھی یہی نقش ونگار وخط وخال ہیں ؛ عقل اتنی اندھی ہے کہ ان گندگیوں اور ناپاکیوں کا احساس بھی نہیں رہا - اور اسی کو صالحانہ مصلحانہ روش سمجھا جاتا ہے ۔

(۲) دوسرا بدل حبطِ اعمال قرار دیا ۔

ولئن اشرکت لیحبطن عملك (الزمر)	اگر شرک کروگے تو تمہارے اعمال غارت ہوجائیں گے ۔

انسان کو اس دنیا میں جو کچھ میسر آتا ہے ، وہ سعی ومحنت کے بعد ملتا ہے ۔ حرکت ہے اور بدل حرکت ہے اعمال ہیں بدل اعمال ہے ۔ بدل عمل ہی کے لئے انسان عمل کرتا ہے ۔ انسان کی تمام تر کوششوں کا مقصد اگر غور کیا جائے ، تو یہی ہے کہ وہ امن وسکون کی زندگی چاہتا ہے ۔ حبطِ عمل کا مطلب یہی ہے کہ اس کو دنیا میں امن وراحت نصیب نہیں ہوتی ، معاشی فراغت حاصل بھی ہو تو طرح طرح کے افکار وآلام میں مبتلا رہتا ہے ؛ نہ دماغ کو سکون ملتا ہے نہ دل کو چین "حقیقی راحت" طمانیتِ قلبی ہے ۔ جو ایک رحمتِ حق ہے ۔ اس سے محروم رہتا ہے ۔ شرک کے یہ عارضی وقدرتی نتائج وثمرات کو آج دنیا بھگت رہی ہے اور یہی مشاہدات " له الدین واصباً " کی صداقت کا اعلان کررہے ہیں ۔ اور یہ یقین دلا رہے ہیں کہ مخالفتِ حق کے بعد بندوں کے لئے نہ امن وسلامتی ہے نہ سکون وراحت ، اس کا انجام آخرت بھی نہایت سخت و شدید ہے ۔

انه من یشرك بالله فقد حرم الله علیه الجنة وماوٰه النار (المائدہ)	بے شک جو اللہ جل شانہٗ کے ساتھ شرک کرے گا اس پر اللہ نے جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ نار ہے ۔

اس کرۂ آتشیں میں یہ خاک کے پتلے نار کے پتلے بن کر ہمیشہ ہمیشہ سوختہ و بریاں رہیں گے

اولٰئك اصحٰب النار ھم فیھا خٰلدون	یہ ناری ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے ۔

تصوف کے مروّجہ سلوک میں شے کو موجود سمجھنا شرک ہے ۔ سلوک میں یہ ایک بنیادی لغزش چلی آرہی ہے ۔ حالانکہ قرآنی تعلیم یہی ہے ۔ کہ افرادِ خلق یعنی غیر اللہ سے احتیاج و بندگی کی نسبت قائم کرنا شرک ہے ۔ قرآنی دعوت یہی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی بندگی کرو اور اس کی بندگی میں کسی فردِ خلق کو شریک مت کرو ،

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہٖ شیئاً (النساء)	اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو ۔

اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ انسان اپنے خالق و رب اللہ جل شانہٗ کا بندہ ہے ۔ اس کو اللہ جل شانہ ہی کا بندہ بن کر رہنا چاہیئے ۔ یعنی عبدیت کی نسبت اللہ ہی سے قائم رکھے ، اور افرادِ خلق میں کسی سے نسبتِ عبدیت (احتیاج و اطاعت) کی نسبت کو وابستہ نہ کرے ، آیت بالا کی تفسیر سورۂ کہف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے

ولا یشرك بعبادۃ ربہٖ احدا (الکہف)	اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیجئے ۔

اس کے معنی یہی ہیں کہ عبدیت کی فطری نسبت خالقِ فطرت ہی سے قائم رکھنا چاہیئے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کو بھی یہی حکم ہے کہ نسبتِ عبدیت اللہ جل شانہٗ سے قائم رکھو اور افرادِ خلق سے نسبتِ عبدیت قائم کر کے شرک مت کرو ۔

قل انما امرت ان اعبد اللہ ولا اشرك بہٖ	کہیئے مجھ کو صرف یہی حکم ہوا ہے کہ میں اللہ ہی کی بندگی کروں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤں ۔

جو لوگ غیر اللہ سے نسبتِ عبدیت قائم کرنے کی تعلیم دیتے ہیں ان کو جاہل فرمایا گیا

قل افغیر اللہ تأمرونی اعبد ایھا الجٰھلون ۔ (الزمر)	کہیئے کہ اے جاہلو ! کیا پھر بھی تم مجھ کو غیر اللہ کی عبادت کرنے کی فرمائش کرتے ہو ۔

یہ آیت سورۂ الزمر کی ہے یہ سلسلہ تعلیم اس آیت پر ختم ہوتا ہے۔

سبحٰنہٗ وتعالیٰ عما یشرکون (الزمر)	وہ پاک و برتر ہے ان کے شرک سے۔

قرآن مجید کی ان محکم آیات سے یہی ثابت ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی موجود کی ہوئی اشیاء مخلوقاتِ ارضی و سماوی عام ازیں کہ وہ مرئی ہوں یا غیر مرئی، ذی عقل ہوں کہ ذی روح۔ ان سے نسبتِ عبدیت قائم رکھنا شرک ہے نہ کہ ان کو موجود سمجھنا شرک ہے۔ موجودات کو اللہ جل شانہٗ کی مخلوق سمجھنے کے بعد پھر ان کے موجود سمجھنے کو شرک قرار دینا ایک ناسمجھی کی بات ہے۔

کُفر

کفر کی تعریف اللہ جل شانہٗ نے ایک جامع آیت میں فرمائی ہے۔

ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسولہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولٰئک ھم الکافرون حقا۔ (سورہ نساء ع ۲۱)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان فرق رکھیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں۔

اس آیت کے چار اجزاء ہیں۔ پہلا جز خدا اور رسولوں کی تکفیر۔ دوسرا جزو احکام خدا اور رسول میں فرق کرنا۔ تیسرا جزو کسی پر ایمان لانا کسی کا انکار کرنا، چوتھا جزو ایک درمیانی راہ اختیار کرنا۔ مطلب یہ ہیکہ احکام و آیاتِ الٰہی، رسالت و احکام رسالت کا انکار کرنے والے، اللہ رسول کے مقرر کردہ فرائض و واجبات اوامر و نواہی، حلال و حرام میں فرق و امتیاز کرنے والے، رسولوں کی لائی ہوئی الٰہی تعلیمات میں فرق کرنے والے، شریعت کے کسی حصہ پر عمل اور کسی حصہ کو ترک کرنے والے۔ دنیا کو مقصود بنا کر آخرت کو فراموش کرنے والے۔ حق و باطل کا ایک مجموعہ مسلک و رویہ

اختیار کرنے والے تمام لوگ کافر اور اس قسم کے خیالات کفر ہیں۔ جس کی تفصیلات کتابوں میں مندرج ہیں۔ چند باتیں جن کو عام طور پر کفر نہیں خیال کیا جاتا بیان کردی جاتی ہیں۔

۱۔ احکامِ دینیہ کو اپنے لئے غیر مفید سمجھ کر اختیار نہ کرنا اور کسی بڑی بات کو بُرا نہ سمجھنا اور اپنے لئے مفید سمجھ کر اس کو اختیار کرنا کفر ہے۔

۲۔ امورِ دینیہ کو اپنے لئے موجب شرم و اہانت سمجھ کر اختیار نہ کرنا کفر ہے۔

۳۔ آخرت کے متعلق یہ تصور کہ مرنے کے بعد دیکھا جائیگا کفر ہے۔

۴۔ اللہ کے افعال پر معترض ہونا، ظلم و ناانصافی، بے رحمی وغیرہ کا کوئی شائبہ اللہ کے متعلق رکھنا کفر ہے۔

۵۔ اللہ سے ناامید ہونا کفر ہے۔

۶۔ موت کے خیال سے دہشت زدہ ہونا اور گھبرانا بہ تعلق دنیا کفر ہے۔

(اگر یہ دہشت و گھبراہٹ اپنے اعمال کے لحاظ سے ہے اور اس سے اصلاح کی طرف توجہ ہو رہی ہے تو یہ دہشت و گھبراہٹ محمود ہے) بظاہر احکام خدا اور رسول کا انکار کفر ہے مگر دراصل یہ فطرتِ انسانی کے باطنی مطالبات کا انکار ہے۔ احکام خدا و رسول فطرت ہی کی ترجمانی ہے۔

نفاق یہ بڑا پوشیدہ مرض ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ و اصحابہ وسلم کی زندگی میں وحی کے ذریعہ سے مومن و منافق کا فرق واضح ہو جاتا تھا۔ نفاق صدق فی الایمان کی ضد ہے، زبانی اقرار و قلبی انکار کا نام نفاق ہے۔ اب نفاق کا حکم ایک مصلح کے لئے بڑی دقتِ نظر کا کام ہے۔ کتاب و سنت میں اس کی جو علامات بیان کردی گئی ہیں ان سے اس چھپے ہوئے مرض قلبی کا پتہ لگا کر انسان اپنی اور دوسروں کی اصلاح کر سکتا ہے۔

پہلی علامت - واذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموا کسالیٰ -

(ترجمہ) اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔

کسالی کا مطلب یہ ہے کہ وقت پر ادا نہ کرنا نہایت تاخیر سے پڑھنا - ایک بوجھ سمجھ کر پڑھنا، اس طرح پڑھنا کہ نہ قیام درست نہ رکوع درست نہ سجود درست، نہ تلاوت درست - ایک لاپروائی اور بے توجہی سے ادا کرنا۔

دوسری علامت - یرآؤن الناس | صرف آدمیوں کو دکھلاتے ہیں -

یعنی جس قدر وہ دینی کام انجام دیتے ہیں، اس میں دکھاوا، ستائش، اور اپنی شہرت مقصود ہوتی ہے۔

تیسری علامت - لایذکرون اللہ الا قلیلا (ترجمہ) اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم -

چوتھی علامت - مذبذبین بین ذٰلک لا الیٰ ھٰؤلاء ولا الیٰ ھٰؤلاء (نسا - ۲۱۴)

(ترجمہ) معلق رہتے ہیں دونوں کے درمیان نہ ادھر نہ ادھر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہوا کے رُخ پر اڑنے والے، پانی کے دھارے پر چلنے والے، کفر کا فروغ دیکھا کفر کے ساتھ ہوگئے، اسلام کا فروغ دیکھا اسلام کے ساتھ ہو گئے -

پانچویں علامت - یأمرون بالمنکر وینھون عن المعروف -

(ترجمہ) نیک کام سے روکتے ہیں! اور بُرے کام کا حکم دیتے ہیں -

نوٹ :- اس کے تحت میں تمام باطل فرقے آتے ہیں - اگر ان کے عقاید بغور دیکھے جائیں-

چھٹی علامت - یقبضون ایدیھم | اپنے ہاتھوں کو روکتے ہیں-

راہ حق میں خرچ نہیں کرتے یعنی انفاق فی سبیل اللہ سے گریز کرتے ہیں -

ساتویں علامت - ان المنافقین ھم الفاسقون -

(ترجمہ) تحقیق کہ منافق نافرمان ہوتے ہیں -

فسق و فجور ہی میں مبتلا رہتے ہیں - حدیث شریف میں بھی چار علامتیں بیان کی گئی ہیں-

وعن عبد الله بن عمرو قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم اربع من كن فيه كان منافقاً خالصاً ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها اذا اؤتمن خان واذا حدث كذب واذا عاهد غدر واذا خاصم فجر (متفق علیہ)

مشکوٰۃ کتاب الایمان باب النفاق

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس میں یہ چار باتیں ہیں وہ خالص منافق ہے اور اگر کوئی ایک خصلت ہے تو وہ نفاق کی خصلت ہے جب امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ بات کرے تو جھوٹ کہے۔ جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے لڑے تو گالی گلوچ کرے۔

اس حدیث میں ترک نفاق کی ترغیب بھی ہے اور یہ بھی تنبیہ ہے کہ ان چاروں خصلتوں کو جب تک دور نہ کیا جائے مرض نفاق سے صحت نہیں ہوسکتی، مسلم کی حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے اس میں اتنا اضافہ ہے کہ :-

وان صام وصلى وزعم انه مسلم

اگرچہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو اور اپنے کو مسلم سمجھتا ہو۔

نفاق کی ایک اور علامت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی ہے ۔

وان المنافق اذا مرض ثم اعفي كان كالبعير عقله اهله ثم ارسلوه فلم يدر لم عقلوه ولم ارسلوه (ابوداؤد)

تحقیق کہ منافق جب بیمار ہوتا ہے پھر آرام دیا جاتا ہے تو ہوتا ہے مانند اونٹ کے کہ باندھا مالک نے پھر چھوڑ دیا سو نہ جانا کہ کیوں باندھا اور کیوں چھوڑ دیا۔

یعنی یہ غور نہیں کرتا کہ یہ مصیبت کیوں آئی اور پھر کیوں چلی گئی ، اور وہ اپنی اصلاح کی طرف مائل نہیں ہوتا ۔ معلم حکمت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے یہ نہایت حکیمانہ ارشادات ہیں ۔ خیانت ، دروغ بیانی ، بدعہدی ، سخت وفحش کلامی اور مصائب کو اپنے اعمال وافکارِ بد کا نتیجہ نہ سمجھنا ، ان جیسے جرائم کا مرتکب صادق الایمان نہیں ہے یہی خصائل اس کے مالی نفع اندوزی اور زبان جان ومال سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں ۔ کفر و نفاق کی بھی جزا

حبطِ اعمال اور ابدی نار ہے۔ بلکہ منافق کے لئے تو جہنم کا آخری طبقہ ہے۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار (النساء)	تحقیق کہ منافقین جہنم کے نیچے کے طبقہ میں ہونگے۔

عموماً یہ مشہور ہے کہ یہی تین سنگین جرائم تمام بداعمالیوں کی جڑ ہیں۔ حالانکہ یہ سنگین جرائم ایک نہایت مہلک مرض سے پیدا ہوتے ہیں۔ جس کا نام حبِّ دنیا ہے۔

ذٰلک بانھم استحبوا الحیٰوۃ الدنیا علی الاخرۃ (النحل)	اس سبب سے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں محبوب رکھا۔

حبِ دنیا اور شرک، کفر و نفاق اضلال کے شعبے ہیں۔ جو جہل کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ گمراہ اور دنیا پرست قوموں کو قرآن میں "قوماً تجھلون" فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا اضلال میں علم کو ثابت کرنا اور اس کو علم حق کا ایک شعبہ کہنا عرفان مروجہ کی ایک بنیادی فکری لغزش ہے جس کی وجہ سے اکثر مسلمات، نصوص قرآنی کے خلاف سلوک مروجہ میں چلے آرہے ہیں۔ مثلاً صراط مستقیم کی اس طرح توجیہ و تعبیر کرنا کہ ضلالت بھی صراط مستقیم ہے۔ بالکلیہ مخالف قرآن ہے۔ کیونکہ اضلال میں جہل ہے۔ جہل کو صراط مستقیم کہنا صحیح نہیں۔

نوٹ:۔ اضلال دراصل حق کو ناحق سمجھنا یا ناحق کو حق سمجھنا ہے۔ جو دراصل جہل ہی ہے۔ باطل کی بھی یہی تعریف ہے۔

ایمان باللہ شرک وغیرہ کی یہ تمام تفصیلات لا الٰہ کی تفسیر ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ کائنات ارضی و سماوی کا خالق، مُدبّر، فرماں روا، رب، الٰہ، مالک و حاکم کوئی نہیں ہے۔ الا اللہ، اللہ ہی الٰہ، واحد ہیں۔ یہی ایمان باللہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان فطرۃ اللہ جل شانہ، کے قوانینِ قدرت کا پابند ہے۔ اللہ بزرگ و برتر کا محتاج و عبد ہے۔ انسان کا نفع و ضرر، ذلت و عزت، ہدایت و گمراہی، افلاس و تونگری، رزق و

عافیت، شادی و غم وغیرہ بالکلیہ اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ افراد خلق میں نفع و ضرر، منع و عطا کی جو قابلیت بظاہر پائی جاتی ہے۔ وہ اذن و ارادۂ الٰہی کے تحت کام کر رہی ہے۔ افراد خلق دراصل نفع و ضرر، منع و عطا کے ذرائع ہیں نہ کہ نافع و ضار۔ مانع و معطی، نیز انسان میں جلبِ منفعت و دفع مضرت کے لئے جو قوائے علمی و عملی ہیں وہ بھی اللہ بزرگ برتر کی عطا ہے۔ ان کو اور اشیاء عالم کو استعمال کرنے کے لئے انسان صرف اللہ بزرگ و برتر کے احکام و ہدایات کا محتاج ہے۔ ہدایات و احکام حق کی اتباع کے بغیر صلاح و خیر، دنیا و آخرت کی فلاح ممکن نہیں۔ اس لئے بجز اللہ کے افراد خلق میں کوئی اس قابل نہیں ہے۔ کہ انسان بہ تعلق حاجت روائی اور دنیا و آخرت کے نفع و ضرر کے تعلق سے بندگی، سرافگندگی اطاعت و انقیاد کا قلبی تعلق ان سے قائم کرے تمام نہیں کہ وہ افراد خلق ملائکہ ہوں یا اجنہ، حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں یا اولیاء کرام۔ ملوک و سلاطین ہوں یا قائدین و رہبران قوم یا کوئی مفکر و مدبر انسان اور تمام افراد خلق اللہ ہی کے علم ہدایت کے محتاج ہیں، اللہ بزرگ و برتر ہی انسان کے اور تمام کائنات کے خالق ہیں رب ہیں، کارساز و کارفرما ہیں، اللہ کی مالکیت و حاکمیت ابدی و لازوال ہے۔ انسان کی موت سے اللہ بزرگ و برتر کی مالکیت و حاکمیت اور انسان کی مملوکیت و محکومیت یعنی عبدیت کا تعلق منقطع نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس فطری تعلق کو قائم رکھنے نہ رکھنے کے نتائج و ثمرات موت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اللہ ہی الٰہ ہیں کے یہی معنی ہیں۔

اس کلمہ کے ذریعہ یہ علم و آگہی بخشی گئی ہے کہ انسان اور افراد خلق [illegible] سے کا مالک و حاکم حقیقی نہیں ہے۔ انسان اس عالم کی کسی شئی حتیٰ کہ اپنی حیات، اعضاء و جوارح مال و متاع، اہل و عیال کا بھی مالک نہیں۔ جو ان کا خالق و رب ہے وہی ان کا مالک ہے۔ ملکیت کی نفی سے حکومت کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ انسان مالک نہیں تو حاکم بھی نہیں۔ انسان مملوک ہے مملوک کی حیثیت حاکمانہ نہیں ہوتی، محکومانہ ہوتی ہے انسان

کا ادعائے ملک وحکومت غلط ہے۔ کذب محض ہے، جہل ونادانی ہے۔ اللہ جل شانہٗ کا مملوک ومحکوم اللہ جل شانہٗ کے احکام وہدایات کے تحت اس عالم سے استفادہ کرکے خوشگوار اور صالحانہ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ مملوک ومحکوم اگر اپنا آئینِ حیات مرتب خود کریگا تو قدم قدم پر ٹھوکر کھائیگا۔ انسان کے نفس میں امارگی کا جو فاسد مادہ ہے اس کی اصلاح کا نسخہ انسان تجویز نہیں کرسکتا، مریض طبیب نہیں ہوسکتا۔ مریض کے لئے نسخہ شفا تجویز کرنا اسی حکیم کا کام ہے۔ جس کا خالق ورب ہونا انسان اور تمام کائنات کے مخلوق ومربوب ہونے کی دلیل ہے اور جس کا حاکم حقیقی ہونا انسان اور تمام کائنات کے محکوم ہونے کی دلیل ہے اور جس کا قیوم ہونا انسان اور تمام کائنات کے قیام وبقاء کی دلیل ہے۔ تمام مخلوقات اور انسان میں ان کے حسب قابلیت اللہ جل شانہٗ کے اسمائے حسنیٰ کا فیض واثر ہے۔ کائنات میں خوبی وکمال کے جو مظاہر ہیں وہ اللہ جل شانہٗ کی خوبی وکمال کے آثار رحمت ہیں اسلئے حمد ہے تو ان ہی کے لئے ہے وہ ہر نقص وعیب سے مخلوق کے جملہ صفات و اعتبارات سے منزہ ہیں۔ اسلئے پاکی سبحانیت ہے تو ان ہی کے لئے ہے۔ ان کے مجوزہ احکام وہدایات وقوانینِ نافذہ میں نہ کوئی خامی ہوسکتی ہے نہ کجی، نہ تغیّر، نہ اختلاف انسان میں تصرف واختیار کا جو ملکہ ہے، وہ بھی مخلوق ہے جو امانتاً انسان کو عطا کیا گیا ہے۔ اس امانت کو استعمال کرنے کے لئے انسان بالکلیہ احکام وہدایات حق کا محتاج ہے۔ لہذا انسان کی صلاح وخیر اور دنیا وآخرت کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ خود کو اپنے خالق ورب کے حوالے وسپرد کردے، ان کے احکام وہدایات کے تحت منازل حیات طے کرے۔

فالٰهكم الٰهٌ واحدٌ فله اسلموا (حج) | بس تمہارا حاکم حقیقی ایک ہی حاکم ہے اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرو

اس روح پرور پیامِ حق وصداقت کے اعلان سے انسان کو بندہ بننے پہ مجبور نہیں کیا جارہا ہے بلکہ نسبتِ عبدیت صحیح کی جارہی ہے۔ ایک مہلک غلطی ایک بڑی گندگی کو

دور کیا جا رہا ہے کہ مخلوق میں سے کسی کو اللہ جل شانہٗ کی فرماں روائی و کارسازی میں شریک قرار دینا یا اپنے آپ کو یا کسی اور انسان کو اپنی زندگی کا کارساز و کارفرما، اصلی مالک و حاکم سمجھ کر اپنی ہوا و ہوس یا کسی اور انسان کی خواہشات کے تحت جانوروں کی سی زندگی گذارنا اپنی فطری حیثیت "بندگی" کا انکار ہے۔ اپنی فطرت سے جہل ہے۔ خالق فطرت، اللہ جل شانہٗ سے بغاوت ہے۔ خدا کو مان کر صریحاً خدا سے انحراف ہے جس کا لازمی نتیجہ عارضی و ابدی زندگی کی ہلاکت و تباہی ہے۔ غفلت کے ان پردوں کو چاک کر کے بھولا ہوا سبق یاد دلایا جا رہا ہے کہ انسان جو فطرتاً اللہ جل شانہٗ کا بندہ ہے اس کو چاہیئے کہ اللہ ہی کی بندگی کرے، اللہ ہی کے احکام و ہدایات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے یہی اس کی فطری خواہش ہے اور اس کے بدل میں وہ ابدی پرمسرت زندگی حاصل کرے۔ جو انسان کی فطرت کا باطنی اور اصلی مطالبہ ہے۔

شرک و توحید کی جو تعریف سطور ماسبق میں بیان کی گئی ہے۔ اس سے توحید کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ یعنی مخلوقات سے نسبت عبدیت متعلق کرنا شرک ہے، اور خالق فطرت سے اس نسبت عبدیت کا قائم کرنا توحید ہے، اللہ ہی سے وابستگی اور گرویدگی توحید ہے، اپنی تمام آرزوؤں، تمناؤں کا ملجا و ماویٰ اللہ ہی کی ذات کو سمجھنا توحید ہے اپنے تمام فطری جذبات خوف، شکر، صبر، محبت وغیرہ کا مرکز صرف اللہ ہی کی ذات کو قرار دینا توحید ہے۔ اپنی زندگی کے سنوارنے بگاڑ سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالے اور سپرد کر دینا توحید ہے۔ معطی و منعم صرف اللہ ہی کو سمجھنا توحید ہے۔ اللہ کی مرضی اور مراد کو اپنی مرضی اور مراد بنا لینا توحید ہے۔ زندگی کے تمام کاروبار صرف احکام و ہدایت حق کے تحت انجام دینا توحید ہے۔ سلوک مروجہ میں رفع اثنینیت یا دوئی کو مٹانا توحید ہے۔ اور انبیائی و قرآنی تعلیمات میں اثبات اثنینیت و دوئی کا قیام ہے خواہ اس کا تعلق صالحیت و شہادت

سے ہو یا صدیقیت (قرب و احسان) سے ہو، صرف صورت و بے صورتی کی دوئی نہیں وجود و صفات کی دوئی، وجود و صفات کی دوئی نہ ہو تو عبد و رب کا فرق صرف منطقی رہ جاتا ہے حالانکہ قرآنی حقائق ذہنی منطقی نہیں ہیں۔ واقعی وجدانی ہیں۔ وجود و صفات بندہ کے لئے بھی ثابت اور رب کے لئے بھی ثابت، قرآنی توحید یہ ہے کہ بندہ اپنے وجود و صفات میں اپنے رب کا محتاج ہے۔ بجز حق تعالیٰ کے بندہ کو موجود کرنا اور باقی رکھنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہی شریعت کی تعلیم ہے۔ اسی سے متحقق ہونا حقیقت و عرفان ہے، صدیقیت ہے۔ وجوداً عبد و رب کو ایک سمجھنا نہ قرآنی توحید ہے نہ حقیقت و عرفان، بلکہ وہم و گمان ہے۔

اجتہادی غلطی قابلِ اصلاح ہوتی ہے نہ کہ قابلِ اتباع۔ غرض نفی وجود وصفات کو توحید سمجھنے کا جو طریقہ سلوک مروجہ میں چلا آرہا ہے کتاب و سنت سے ثابت نہیں ہے نفی وجود وصفات و افعال کا صرف یہ مطلب صحیح ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے وجود و صفات و افعال میں ہر آن اللہ کا محتاج ہے نہ یہ کہ انسان میں جو وجود و صفات ہیں۔ تقییداً و تشبیہاً وہ اللہ ہی کے اصلی صفات ہیں۔ سورہ زمر کی یہ جو ایک محکم آیت ہے۔

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللہ لھم البشریٰ فبشر عباد الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰئک الذین ھداھم اللہ و اولٰئک ھم اولوا الالباب (زمر ع۲)

اور جو لوگ شیطان کی عبادت سے بچتے ہیں اور اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں وہ خوشخبری کے مستحق ہیں سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں اور اس کی اچھی باتوں پر چلتے ہیں یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ یہی اہل عقل ہیں۔

اس آیت میں حق تعالیٰ ان لوگوں کو جو طاغوت کی عبادت نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ہی کی

طرف رجوع کرتے ہیں اولئک الذین ھداھم اللہ و اولئک ھم اولوا الالباب فرماتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اہل ہدایت اور اہل عقل وہی ہیں جو نسبت عبدیت، احتیاج و غلامی کی نسبت مخلوقات (یعنی غیر اللہ) سے وابستہ نہیں رکھتے اللہ ہی سے وابستہ رکھتے ہیں نہ کہ وہ لوگ جو موجودات کے وجود کی نفی کرتے ہیں۔ لا الٰہ کے ذریعہ موجودات سے وجود و توابعات کی نفی نہیں کی جارہی ہے بلکہ مخلوقات سے انسانوں نے بوجہ جہل جو نسبت عبدیت قائم کر رکھی تھی، اس کی نفی کر کے نسبت عبدیت کا استحقاق صرف حق تعالیٰ کے لئے ثابت کیا جارہا ہے۔ یہی قرآنی دعوت ہے۔ اور یہی انبیاء کی تعلیم ہے اور یہی شریعت کا بنیادی عقیدہ ہے۔ اس کے خلاف جو تعلیمات ہوں وہ قرآنی اور انبیائی نہیں ہوسکتے، معرفت کی وہ تعلیم جو قرآنی اور انبیائی نہ ہو قابل قبول نہیں اور نہ وہ عرفان درست ہے جو کسی مرتبہ میں بھی عقائد شریعت کے خلاف ہو۔ یہ کہنا کہ کمال ایمان موجودات سے وجود و توابعات وجود کی نفی ہے نہ قرآنی فکر ہے اور نہ ان صحیح احادیث سے ثابت ہے جو کمال ایمان پر دلالت کرتی ہیں اور جو جذبۂ محبت کی تشریح میں بیان کی گئی ہیں۔

الحاصل انسان لا الٰہ کے ذریعہ نفس و شیطان اور تمام افراد خلق کی غلامی کی زنجیریں کاٹ کر الا اللہ کے ذریعہ الٰہ واحد کے در رحمت پر سرافگندہ ہوجاتا ہے۔ عبدیت کی نسبت صحیح ہوجاتی ہے۔ اس کلمہ کے جزو اوّل لا الٰہ الا اللہ میں بندگی کا عہد ہے پیمان بجود ہے، حقیقی مالک سے وفاداری کا وعدہ ہے۔ اور عارضی زندگی میں امن وسلامتی اور ابدی بامراد زندگی کی طلب ہے۔ اور جزو آخر محمد رسول اللہ میں ایک قال بندہ حق، معلم کتاب و حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کا اقرار ہے زبانی عہد و اقرار نہیں، قلبی بندگی و شوق ہے غرض متاع عمل و دل و جاں کئے ہوئے نفس کے ایک مندرجہ ذیل فطری جذبات (۱) خوف (۲) شکر (۳) صبر (۴) محبت (۵)

ذکر (۶) اعتماد و بھروسہ (توکل) (۷) دعا و طلب امداد (۸) اطاعت و سرافگندگی (۹) اعتراف قصور و ندامت و طلب عفو (توبہ) کا تعلق باطل مراکز سے منقطع ہو کر اللہ جل شانہٗ سے قائم ہو جاتا ہے اور صالحانہ زندگی کی ابتداء ہو جاتی ہے۔ جو حیاتِ ایمانی کی پہلی منزل اور صدق و اخلاص کا پہلا مقام ہے۔

جذبات کی تشریح

۱۔ خوف و رجا۔ انسان اسی سے خوف کرتا ہے جس سے اپنی جان و مال و اولاد و عزت وغیرہ کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے کلمۂ حق و صداقت کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کی گئی کہ اذنِ الٰہی کے بغیر مخلوق میں سے کوئی نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ضرر ذلت، عزت، منع و عطا۔ زندگی کو سنوارنا اور بگاڑنا مخلوق کے اختیار میں نہیں۔ صرف اللہ بزرگ و برتر کے اختیار میں ہے۔ جہاں کہیں مخلوق سے ذلت و عزت، منع و عطا نظر آئے وہ اللہ تعالیٰ کے عطاء و منع و انعام کا واسطہ و ذریعہ ہے۔ احکام و ہدایات حق کی اتباع کے بغیر انسان کے فطری مطالبات کی تکمیل نہیں ہو سکتی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ جب انسان اس پیامِ حق و صداقت کو تسلیم کر لیتا ہے تو دل میں اللہ جل شانہٗ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے اور مخلوق کا خوف باقی نہیں رہتا، اللہ کے خوف کے معنی ہیں اللہ کی ناراضگی کا خوف وہ یہ ہے کہ انسان اگر اللہ کے احکام و ہدایات پر عمل نہ کرے تو اللہ کی توجہ و رحمت سے محروم رہ کر خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو جانا یقینی ہے۔ دنیا میں یہ نقصان کہ ہدایت کی توفیق نصیب نہیں ہوتی اور آخرت کا یہ نقصان کہ جہنم اس کا ٹھکانا ہوگا۔ اللہ کا خوف جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر عبادت و اطاعتِ حق میں پختگی پیدا ہوگی۔ نفس و شیطان کی مخالفت پر انسان آمادہ رہیگا اور باطل کی قوتوں سے بے خوف ہو کر دین کی حفاظت و اشاعت کا حوصلہ و ہمت اس میں پیدا ہوتی جائے گی اقتضاء ایمان یہی ہے کہ دل میں مخلوق کا خوف

تو رہے اللہ ہی کا خوف رہے ۔

فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مؤمنین (آل عمران ع ۱۸)	پس تم ان سے مت ڈرو ، اللہ ہی سے ڈرو ، اگر تم مومن ہو ۔

خوف ظالم کا بھی ہوتا ہے مگر ظالم کا خوف ظالم سے دور رکھتا ہے ۔ اور اللہ کا خوف اللہ کی رحمت سے قریب کرتا ہے ۔ رحمتِ حق سے انسان جس قدر قریب ہوگا اسی قدر اس کو فلاح دارین حاصل ہوتی جائیگی ۔ بعض قطعی مہلکات سے بھی انسان کے دل میں خوف رہتا ہے وہ خوف اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظام کا خوف ہے مثلاً آگ میں جو سوزش وجلن ہے وہ دراصل اللہ بزرگ و برتر کا مقرر کردہ نظام ہے اس نظام کی خلاف ورزی کے مہلک نتائج سے جو خوف پیدا ہوتا ہے وہ خدا ہی کا خوف ہے بشرطیکہ دانش صحیح رہے غرض اللہ جل شانہ سے خائف رہنے کا مطلب یہی ہے کہ دل میں مخلوق کا خوف نہ رہے اور انسان ان تمام خواہشات کی پیروی سے اجتناب کرے جو دنیا و آخرت میں اس کیلئے سخت مضر ہیں ۔

واما من خاف مقام ربہٖ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ (پ۳۰ النزعٰت)	اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز خواہش سے روکا تو جنت اس کا ٹھکانا ہے ۔

اللہ کا خوف دل میں پیدا ہو جانے کے بعد امیدیں بھی اللہ ہی سے وابستہ ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ سے ناامید ہونا منافی ایمان ہے ۔

۲ ۔ شکر ۔ اس جذبہ کا تعلق احسانات الٰہی سے ہے ۔ واقعہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا بقائے حیات کے لئے تمام اسباب پیدا کئے ۔ ان سے استفادہ کرنے کے لئے دل و دماغ ، دیکھنے ، سننے کی قوت عطا فرمائی ۔ اور بڑا احسان یہ کہ ہماری فلاح کے لئے ایک نبیِ کامل کو مبعوث اور ایک آئین بندگی نازل فرمایا تمام اللہ جل شانہٗ کے

احسانات ہیں اس لئے وہی مستحق شکر ہیں جو نعمت بھی انسان کے پاس ہے حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ہے۔

وما بکم من نعمة فمن الله (النحل)	جو نعمت بھی تمہارے پاس ہے اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

تمام ظاہری و باطنی نعمتیں عطا فرما کر۔

واسبغ علیکم نعمہٗ ظاھرۃً وباطنۃً (سورہ لقمان)	اور اس نے تم پر ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔

اتمام نعمت فرما دیا۔

اتممت علیکم نعمتی (سورہ مائدہ)	اپنی نعمت تم پر تمام کر دی۔

اس لئے حکم یہی ہے۔

واشکروا نعمت الله ان کنتم ایاہ تعبدون۔ (سورہ النحل)	اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو۔

شکر کے تین اجزاء ہیں۔

(۱) ہر نعمت کو من اللہ سمجھنا۔ (۲) جس مقصد کے لئے نعمت دی گئی ہے اسی مقصد کے لئے اس کو استعمال کرنا۔ (۳) منعم و معطی کی تعریف کرتے رہنا۔

زندگی اور بقائے زندگی کے اسباب کو بغرض عبادت استعمال نہ کیا جائے تو یہ کفرانِ نعمت ہے مومن اپنے کاروبار میں حق تعالیٰ کی نعمتوں کو جس قدر یاد رکھے گا اسی قدر وہ اللہ جل شانہٗ کا شکر ادا کرتا رہے گا۔ خصوصاً نعمتِ دین کے ادراک سے قلب ایک مسرت محسوس کریگا، کیونکہ لاکھوں بندگانِ خدا اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں احکام دین پر کما حقہٗ عامل رہنا نعمتِ دین کا شکر ادا کرنا ہے نعمت جتنی اہم ہوگی اتنی ہی اس کی مسرت اور قدر زیادہ ہوگی اور منعم و معطی کا شکر بھی اسی قدر زیادہ ہوگا اور قانون الٰہی یہ ہے کہ جسقدر شکر کیا جاتا ہے اسی قدر نعمتِ دین و ایمان میں پختگی اور استحکام ہوتا ہے اور

تکمیل ایمان کا مقام عنایت کیا جاتا ہے۔

لئن شکرتم لازیدنکم (ابراہیم)	اگر تم شکر کرو تو اور زیادہ دیا جائیگا۔

اس بشارت میں سب سے زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ وعدۂ ازدیاد نعمت کے بعد زوال نعمت کا احتمال باقی نہیں رہتا گویا خاتمہ بالخیر ہونے کے بارے میں قلب کو ایک اطمینان بھی حاصل رہتا ہے۔

غور کیا جائے تو زندگی کی ہر سانس، ہر حرکت، ہر سکون ایک نعمت ہے ان بے حد و بے حساب نعمتوں کا شمار نہیں کیا جا سکتا حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کیا شکر ادا کر سکتا ہے۔ حق تعالیٰ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ اس اعتراف عجز ہی کو شکر قرار دیتے ہیں۔

انسان کی زندگی دو حال سے خالی نہیں راحت ہے یا مصیبت، دین و ایمان کی سلامتی اور ترقی اسی میں ہے کہ راحت کا زمانہ شکر میں اور مصیبت کا زمانہ صبر میں گزرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الایمان نصفان نصف فی الشکر ونصف فی الصبر۔	ایمان کے دو حصے ہیں نصف شکر میں ہے اور نصف صبر میں۔

گویا شکر و صبر کے بغیر ایمان کامل نہیں ہوتا۔ فطرتِ انسانی کمال کی طالب ہے اللہ جل شانہ کی یہی مرضی ہے کہ بندۂ مومن کامل الایمان ہو جائے۔ اس لئے راحت و مصیبت کی ساعتیں اس پر گزرتی رہتی ہیں۔ تاکہ بندہ کمال ایمان کا مقام حاصل کرے۔

۳۔ صبر و رضا بالقدر:۔ راحت و آسائش کی جد و جہد میں جو تکلیف پہنچتی ہے ان کو گوارا کرنا، نیز ان پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔ حق تعالیٰ کی جن نعمتوں میں ہم پرورش پا رہے ہیں۔ ان سے استفادہ کر رہے ہیں کبھی وہ نعمتیں امتحان کے لئے یا ہمارے گناہوں کی وجہ سے یا کسی اور حکمت کے تحت ہم سے چھین لی جاتی ہیں۔ اسی کا نام مصیبت ہے اس زندگی میں تحت حکمت حق تعالیٰ کوئی نعمت چھین لیتے ہیں تو اخروی زندگی میں

اس کا بے حساب بدل عطا فرماتے ہیں اس تعلق سے مصیبت برداشت کرنے کا نام صبر ہے
صبر کے تین اجزاء ہیں۔

۱۔ مصیبت کو من اللہ سمجھنا خواہ وہ کسی صورت سے پہنچے۔
۲۔ اس کو اپنے لئے خیر سمجھ کر شکوہ و شکایت نہ کرنا۔
۳۔ مصیبت کو برداشت کرنا۔

برداشت کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مصیبت کے دفعیہ کے لئے دعا اور شرعی و اختیاری تدابیر اختیار نہ کی جائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ حیرانی و بدحواسی نہ ہو اور ناجائز طریقے اختیار نہ کئے جائیں اور شرعی تدابیر اختیار کرنے کے بعد بھی اگر مصیبت دفع نہ ہو تو قلب میں شکایت و اعتراض نہ پیدا ہو کیونکہ دعا اور تدابیر اختیار کرنے کے سلسلے میں جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ امتثال امر ہونے کی وجہ سے عبادت کی تعریف میں داخل ہیں جس کا اجر آخرت میں قطعی ہے۔

ایمان لانے کے بعد بسا اوقات مصیبت ضرور نازل ہوتی ہے بشرطیکہ ایمان حقیقی اور سمجھ کر اختیار کیا گیا ہو۔ یہ مصیبت امتحان کے لئے ہوتی ہے اللہ بزرگ و برتر کو رب تسلیم کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے ہمہ خیر ہیں۔ رب اسی کو کہتے ہیں جس کے پیش نظر مربوب کی صلاح و خیر ہو اور حقیقت یہی ہے کہ اللہ کے پیش نظر اپنے بندوں کی صلاح، خیر و فلاح ہی ہے۔ یہ ایمانی کیفیت قلب میں کس حد تک راسخ ہوئی ہے اس کو حق تعالیٰ تو جانتے ہی ہیں مگر انسان نہیں جانتا۔ اس لئے انسان کو اس کے قلب کی کمزوری سے مطلع کرنے کے لئے مصائب نازل فرماتے ہیں تاکہ مومن اپنی کمزوری سے آگاہ ہو کر اصلاح حال کی طرف توجہ کرے۔ انسان کی کمزوری یہی ہے کہ اللہ جل شانہٗ کو رب تسلیم کرنے کے باوجود جب زندگی کے انقلابات، واقعات، انسان کی مرضی کے خلاف پیش آتے ہیں تو وہ ان پر معترض ہوتا ہے چین بجبیں ہوتا ہے۔ شکوہ شکایت

کرتا ہے کہ "ایسا کیوں ہوا، یہ نہ ہونا تھا، یوں ہوتا تو بہتر ہوتا وغیرہ وغیرہ" ایسے خیالات واعتراضات، اقرار ربوبیت کے منافی ہیں اس لئے قلب کی اس باطنی گندگی کو دور کرنے کے لئے جان، مال، بھوک، پیاس اور دیگر نقصانات سے اللہ جل شانہ' آزماتے ہیں اس امتحان کے موقع پر ہر مومن کو چاہیئے کہ ان مصائب کو برداشت کرے یعنی صبر کرے۔ ان کو من اللہ سمجھے، اپنے لئے خیر سمجھے، ان کے نازل ہونے اور دفع نہ ہونے پر نہ معترض ہو نہ حیران و پریشان، نہ شکوہ شکایت کرے بلکہ اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ خصوصاً اہل باطل کی جانب سے اشاعتِ حق کے سلسلہ میں اہل حق کو جان و مال کی تکالیف پہنچتی رہتی ہیں یہ بھی در اصل اللہ جل شانہ' ہی کی طرف سے ایک امتحان ہے اس امتحانی دور میں اگر مومن کی زندگی ختم ہو جائے تو اس کو شہادت کا درجہ عطا کیا جاتا ہے اور اگر یہ دور کامیابی سے گزر جائے تو بندہ مومن اللہ جل شانہ' کی رحمت خاص و عام کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کو ہدایت کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنے کی بشارت دی جاتی ہے۔

ولنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع و نقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصّٰبرین الذین اذا اصابتهم مصیبة قالوا انا لله وانا الیه راجعون اولٰئك علیهم صلوٰت من ربهم ورحمة واولٰئك هم المهتدون (البقرہ)	اور البتہ ہم تمہاری آزمائش کریں گے کسی قدر خوف سے اور فاقہ سے اور مال اور جان اور پھلوں کے نقصان سے اور آپ ایسے صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے کہ جب ان پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ ہی کے پاس جانے والے ہیں (جہاں اس نقصان کا بہترین بدل عطا کیا جائیگا

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی خاص و عام رحمت ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر گامزن ہیں۔

کیا فضل و کرم ہے کہ صبر کے ساتھ جان دیدی تو شہادت کا درجہ پایا اور صبر کے ساتھ زندہ رہے تو ہدایت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے اور مستحق رحمتِ خاص و عام ہونے کی بشارت ملی۔ الحمد للہ رب العالمین۔

صبر کی مختلف صورتیں ہیں۔ (۱) بالعموم دنیا اہل باطل پر کشادہ نظر آتی ہے جسے دیکھ کر مومن کے دل میں گرانی پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ خیال کرتا ہے کہ ہم تو اللہ جل شانہ کی بندگی کرتے ہیں ان کو اپنا رب و حاکم تسلیم کرتے ہیں۔ مگر دنیا ہم پر کشادہ نہیں ہے۔ یہاں صبر کا پہلو یہ ہے کہ اسلام لانے کے یہ معنیٰ ہیں کہ مفاد دنیا کے مقابلہ میں مفاد آخرت کو ترجیح دی گئی۔ مقصود و مطلوب دنیا نہیں آخرت ہے اب اگر دنیا تنگ ہے تو یقیناً دنیا کشادہ ہونے میں ہمارا ضرر آخرت ہے یہ حکمت الٰہی واضح ہونے کے بعد اہل باطل کو اپنے مقابلہ میں خوش حال دیکھ کر قلب میں حزن و ملال پیدا نہ ہوگا۔ اور صبر کا مقام حقیقی معنوں میں حاصل ہوگا بلکہ شکر پیدا ہوگا۔

(۲) ایمان و عمل صالح کے بدل کا مطالبہ اس دنیا میں نہ چاہے بلکہ اُخروی زندگی میں اس کا بدل چاہے۔

(۳) ناجائز خواہشات کو بخوف ضرر آخرت قابو میں رکھے اور جائز خواہشات اگر پوری نہ ہوں تو جزائے آخرت کو پیش نظر رکھ کر دلگیر نہ ہو۔

(۴) حفاظت دین و ایمان اور اشاعت حق کے سلسلہ میں لوگوں کی بدگوئی و بداخلاقی ترش روئی، لعن طعن کو بطیب خاطر برداشت کرتے ہوئے اپنے فرض کو انجام دیتا رہے۔

(۵) برائی کا جواب برائی سے نہ دے بلکہ اس کو خوبی کے ساتھ درگزر کرے۔

(۶) اشاعت حق یا حفاظت دین کے سلسلہ میں اگر ترک وطن پر مجبور ہونا پڑے تو تمام تکالیف سفر وغیرہ کو بطیب خاطر گوارا کرے

ہدایت کے بلند منازل طے کرنے کیلئے شکر و صبر دو راہیں ہیں اور تکمیل ایمان یہ ہے کہ صبر نکل جائے شکر ہی شکر رہے۔ جیسا کہ حضرت معلم حکمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ ؕ

جزائے صبر۔ ان اللہ مع الصّابرین۔ معیّت کے معنی تائید و نصرت کے ہیں

یعنی مشکلات آسان کر دی جاتی ہیں۔

واللہ یحب الصٰبرین۔ محبوب کو کوئی مبتلاء آلام نہیں رکھتا۔ دفع مصیبت کے اسباب فراہم کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر مصیبت کا باقی رہنا ہی مومن کے لئے خیر ہے تو مصیبت کے تعلق سے جو حزن والم قلب میں پیدا ہوتا ہے اس کو حق تعالیٰ دفع فرما دیتے ہیں اور سکون وطمانیت پیدا کر دیتے ہیں۔ نیز اس آیت کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ مومن پر مصائب کا نازل ہونا اس کے محبوب حق ہونے کی خاص علامت ہے۔ جیساکہ ارشاد نبوی ہے۔

وان اللہ عزوجل اذا احب قوماً ابتلاھم (الخ) (ترمذی وابن ماجہ)	جب دوست رکھتا ہے اللہ کسی کو تو اس کو آزماتا ہے۔

ایک اور ارشاد ہے۔

من یرد اللہ بہٖ خیراً یصب منہ (بخاری)	اللہ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کچھ لے لیا جاتا ہے۔

صبر کی ایک جزا یہ بھی ہے کہ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا کیا جائیگا۔

انما یوفی الصٰبرون اجرھم بغیر حساب (الزمر)	بے شک صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔

یعنی صبر کرنے والوں سے نامۂ اعمال کی پرسش نہ ہوگی۔

صبر کا اعلیٰ مقام رضا بالقدر ہے، اللہ جل شانہٗ نے رزق، صحت و عافیت کے لحاظ سے جس حال میں رکھا ہے اسی میں خوش رہنا، صورت مصیبت میں رحمتِ حق کا مشاہدہ کرنا رضا بالقدر ہے۔ شدتِ تکلیف سے بے چین ہونا، کراہنا منافی رضا نہیں ہے۔ جیسے کڑوی دوا پیتے وقت تکلیف ہوتی ہے مگر قلب اس سے راضی رہتا ہے۔ نیز رضا بالقدر یہ ہے کہ دفع مصیبت کو مقصود بنا کر دعا و تدبیر نہ کی جائے بلکہ

صرف تکلیف یا مصیبت کا اظہار ارحم الراحمین کے حضور میں کر دیا جائے اس لئے نزول قضا و قدر کے موقع پر جو مسنون دعا ہے یہ ہے۔ اللھم انی اسئلک الرضا بعد القضاءً

۴۔ محبّت ۔ پہلا طریقۂ فکر۔ محبّت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے فطرۃً انسان کو اپنی جان سے بہت محبّت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ تمام اشیاء جن پر اس کی زندگی کی پرورش و بقاء کا مدار ہے ان کو محبوب رکھتا ہے مثلاً مال و دولت ، بیوی، بچے وغیرہ اور اس کا فطری جذبۂ حب ان ہی مختلف مراکز سے وابستہ رہتا ہے۔ دین کی دعوت قبول و اختیار کرنے کے بعد جب یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ وہ جان جو سب سے زیادہ عزیز و محبوب ہے۔ اور وہ تمام محبوبات و مرغوبات جو جان کے تعلق سے عزیز ہیں حق تعالٰے کی عطا کی ہوئی نعمتیں ہیں۔ بقائے حیات کے لئے تمام اشیاء کا انسان کے ساتھ توافق اور اس کے لئے ممد و معاون حیات ہونا حق تعالیٰ ہی کا فضل و احسان ہے تو محبّت کے تمام باطل مراکز ٹوٹ جاتے ہیں اور فطری جذبہ محبّت کا مرکز بجز خالق فطرت کے کوئی نہیں رہتا۔ محسن اور حاجت روا سے فطرۃً انسان محبّت کرتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ حقیقت شناس یعنی اہل ایمان کو اللہ ہی سے شدید محبّت ہوتی ہے

والذین اٰمنوا اشد حباً للّٰہ (بقرہ)	اور ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ ہی سے رکھتے ہیں

آیت کریمہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مخلوق سے انسان کو محبّت نہ ہو کیونکہ خلق کی جانب بھی انسان فطری میلان رکھتا ہے۔ بلکہ اللہ جل شانہٗ سے شدید محبّت ہونیکا اثر یہ ہے کہ مخلوق کی محبّت احکام ہدایات حق کی بجا آوری میں مانع و مزاحم نہیں رہتی۔ ابدی حیات جو رضائے حق کے ظہور کا اصلی مقام ہے اس کا واقعہ ہونا جب دل نشیں ہو جاتا ہے۔ تو اس عارضی حیات کو رضائے حق کے لئے قربان کر دینے کا جذبہ انسان میں موجزن ہو جاتا ہے ، اس طرح وہ جان و مال جو سب سے زیادہ عزیز ہیں وہ بھی عزیز نہیں رہتے۔ حق تعالیٰ سے محبّت ہو جانے کے بعد حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتیں جان و مال و اولاد و دیگر ظاہری

و باطنی نعمتیں بھی محبوب ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اب اُن کی محبت، محبتِ حق کے منافی نہیں ہوتی اور ان نعمتوں کی حفاظت ایک اہم خدمتِ حق ہو جاتی ہے۔

دوسرا طریقۂ فکر۔ فطرۃً انسان اسی سے محبت کرتا ہے۔ جو اس کو سب سے زیادہ چاہتا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ اپنی ساری مخلوقات میں انسان کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ جس کی ایک علامت یہ ہے کہ تمام مخلوقات میں سب سے اچھی صورت انسان کی بنائی۔

وصورکم فاحسن صورکم (التغابن) | اور تمہاری صورت بنائی۔ پس عمدہ صورت بنائی۔

یہ تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ کوئی خیالی بات نہیں تمام جانداروں میں انسان کی صورت ہی سب سے اچھی صورت ہے۔

دوسری علامت سب سے زیادہ چاہنے کی یہ ہے کہ انسان کے اکل و شرب کیلئے ان غذاؤں کا انتخاب فرمایا جو سب سے بہتر ہیں۔ عمدہ قسم کے جانور، عمدہ قسم کے میوے، عمدہ قسم کے مشروبات، عمدہ قسم کے نباتات، الا ان کے جو انسان ہی کی حیاتِ عارضی و ابدی کے لئے مضر ہیں۔

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً (النحل) | جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال اور عمدہ دی ہیں کھاؤ۔

خود فطرتِ انسانی میں یہ لطافت ودیعت ہے کہ ناقص، خراب، بدذائقہ، بدبودار اور گھاس و فضلہ کی قسم سے کوئی چیز انسان کو پسند نہیں ہے۔ نیز انسان کو تمام مخلوقات کے مقابلہ میں مکرم و صاحبِ عزت بنایا۔

لقد کرمنا بنی آدم | ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا۔

جس کی واضح علامت یہ ہے کہ تمام مخلوقات کو انسان کے لئے پیدا کیا۔

خلق لکم ما فی الارض جمیعا (البقرہ) | زمین پر جو شئے ہے تمہارے لئے پیدا کی گئی۔

اور تمام مخلوقات کو انسان کا مسخر کر دیا اور انسان کو ان پر تصرف کا اختیار عطا فرمایا۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السموٰت وما فی الارض۔ (لقمان)	کیا نہیں دیکھتے ہو کہ مسخر کر دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے۔

نیز ایک حاکمانہ شان سے زندگی بسر کرنے کے لئے حکومت و سیاست کی قابلیت عطا فرمائی جو کسی مخلوق کو عطا نہیں کی گئی۔

انی جاعل فی الارض خلیفۃ (البقرہ)	میں زمین میں ضرور ایک نائب بناتا ہوں۔

ان تمام خصوصی عنایتوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔ اس دانش و آگاہی کا لازمی اثر یہی ہے کہ انسان کو بھی اللہ تعالیٰ ہی سے سب سے زیادہ محبت ہو۔

تیسرا طریقۂ فکر۔ محبت خیر و خوبی و کمال سے پیدا ہوتی ہے چونکہ انسان میں شر و نقص ہے اس کی وجہ سے یہ خیر و خوبی و کمال کا طالب ہے۔ خیر و کمال کی اس فطری طلب کی بناء پر صاحب خیر و خوبی کی جانب انسان فطری میلان رکھتا ہے۔ اور صاحبِ خیر و خوبی سے محبت و گرویدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ جل شانہٗ ہی تمام صفاتِ جمالیہ و کمالیہ سے موصوف ہیں۔

للہ الاسماء الحسنیٰ	تمام اسمائے حسنےٰ اللہ ہی کے لئے ہیں۔

یعنی وہ تمام صفاتِ جمالیہ و کمالیہ جو کسی کے نقص و شر کو رفع کر کے اس میں خیر و کمال پیدا کر دیتے ہیں۔ بجز اللہ جل شانہٗ کے کوئی ان سے متصف نہیں ہے۔ انسان اور تمام مخلوقات میں جو کچھ خوبی و کمال پایا جاتا ہے وہ اللہ جلّ شانہٗ کے اسمائے حسنیٰ کا اثر ہے جو سراسر جاری و ساری ہے اور جو انسان و تمام مخلوقات کی مربوبیت و بندگی پر دلالت کرتا ہے اور انسان فطرۃً اس ذاتِ اعلیٰ و عظیم سے جو احتیاجی نسبت رکھتا ہے اس کو نمایاں کر رہا ہے نیز انسان فطرۃً ابدی راحت و شادمانی کا بھی طالب ہے۔ اس مطالبہ کی تکمیل بھی اسمائے حسنیٰ ہی کے فیضان پر منحصر ہے۔ غور و فکر سے یہ احتیاجی نسبت جس قدر مبرہن

اور اسمائے الٰہیہ کے فیضان کا ادراک جس قدر قائم ہوتا جائے گا حق تعالیٰ ہی تمام مخلوقات اور محبوب چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جائیں گے ۔

چوتھا طریقۂ فکر ۔ نظام کائنات پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سارے عالم میں محبت ہی کارفرما ہے ۔ ایک قانون کشش ہے جو تمام عالم میں جاری و ساری ہے ہر شئی انسان کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور ہر شئی جس کو انسان اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور ہر شئے جو ایک دوسرے کے ساتھ توافق کر رہی ہے ۔ اور توافق اشیا کا یہی نظام انسان کی بقائے حیات کے لئے ممد و معاون ہے یہ محبت ہی کا کرشمہ ہے جو اس حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے کہ اس نظام کائنات کو جس کامل ہستی نے بنایا ہے اور جس کی توجہ وارادات سے یہ نظام قائم و جاری ہے ، رحمت و مودت کا وہی سرچشمہ ہے الرحمٰن ہی کی رحمت ہے کہ انسان جی رہا ہے ، پرورش پا رہا ہے ، منازل حیات طے کرتا ہوا منزل مقصود کو پہنچ رہا ہے ۔

رحمانیت کی اجمالی تشریح :۔ یہ ہے کہ شئے اور شئے میں حرکت کا پیدا کرنا اس کے آثار و خواص کو پیدا کرنا ، صحیح و غلط استعمال کے نتائج کو پیدا کرنا ، صحیح یا غلط استعمال کے طریقوں سے اور ان کے مفید و مضر نتائج سے انسان کو آگاہی بخشنا ۔ سعی و محنت کا عارضی و ابدی بدل بلحاظ سعی و محنت عطا کرنا یہ سب شان رحمانیت ہے حق تعالیٰ کی رحمت و مودت کا جو سلوک رات دن انسان کے ساتھ ہو رہا ہے کہ ان کی توجہ و عنایت کے بغیر انسان کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا ۔ اس پر انسان جس قدر فکر کرے گا اور جس قدر یہ حقیقت مبرہن ہوتی جائے گی اسی قدر اللہ کی محبت کے جذبات بیدار رہیں گے ۔

حق سبحانہ تعالیٰ کی رحمانیت اسم الرحمٰن کے متعلق جس قدر شرح صدر ہوتا جائیگا اسی قدر حق تعالیٰ سے محبت و گرویدگی میں اضافہ ہوتا جائیگا ۔ واقعہ یہ ہے کہ رحمانیت ہی تخلیق عالم ، قیام عالم ، نظام عالم کی علت غائی ہے ۔ اجرائی اوامر و احکام اور جزائے عمل مکافات عمل

کا اٹل نظام رحمانیت ہے اسی لیے عرش الٰہی جہاں سے احکام جاری ہوتے ہیں اس کے استوا کا ذکر بھی الرحمٰن کے ساتھ ہے۔

الرحمٰن علی العرش استویٰ (طٰہٰ ع ۱)

جزائے اعمال کا جو یوم عظیم مقرر ہے اس دن صرف الرحمٰن ہی کی حکومت ہوگی۔

الملک یومئذ الحق للرحمٰن (الفرقان ع ۳)	اس روز حقیقی حکومت رحمان ہی کی ہوگی۔

الرحمٰن ہی کو سمجھنے کا حکم ہے۔

الرحمٰن فسئل بہ خبیرا (الفرقان ع ۵)	رحمان کو کسی جاننے والے سے پوچھ۔

رحمان ہی کو قبول و تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور انکار کرنے والوں نے رحمانیت ہی کا انکار کیا۔

واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن (آیت سجدہ) (الفرقان ع ۵)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ سجدہ کرو رحمان کو تو کہتے ہیں کہ رحمانیت کیا ہے۔

اسمائے الٰہیہ جن کا تعلق عمل و بدلِ عمل سے ہے وہ تحت رحمانیت ہیں اور عفو و بخشش جو ہے وہ تحت رحیمیت ہے رحمانیت و رحیمیت سے عالمین کی پرورش ہو رہی ہے اسی لئے فرمایا گیا جو رب العالمین ہے وہی الرحمٰن الرحیم ہے۔ الرحمٰن الرحیم کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم دنیائے حیات و ممات، سعی و عمل کی یہ تمام ہنگامہ آرائی اور جزائے اعمال کا ابدی مکمل عالم آخرت اسمائے حسنیٰ الرحمٰن الرحیم کے فیضان و آثار سے وابستہ ہے، قائم و دائم ہے۔ الرحمٰن الرحیم ہی جذبۂ حب کا اصلی مرکز ہے۔

اسی طرح جو ذات اس مبدءِ رحمت سے انسان کو وابستہ کر دے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ فطرتِ انسانی ہے کہ وہ ذاتِ مبارک بھی سب سے زیادہ محبوب ہوگی اللہ کی محبت ہی رسول اللہ کی محبت ہے اور رسول اللہ کی محبت ہی اللہ کی محبت ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کی جہت سے جب

تک ماں باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جائیں ایمان کامل نہیں ہوتا -

لایؤمن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین (مشکوٰۃ)	مومن نہیں ہوتا تم میں کوئی جب میں اس کے نزدیک زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں باپ بیٹے اور تمام لوگوں سے -

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی اپنی جان ومال واولاد سے زیادہ اپنی امت کو محبوب رکھا - امت ہی کے لئے شاہانہ زندگی اختیار نہ کر کے فقیرانہ زندگی اختیار فرمائی ہر قسم کے مصائب امت پر آسان ہو جانے کے لئے اور ان کی تسلی کی خاطر آپ نے فقر بطیبِ خاطر گوارا فرمایا - وہ مخصوص دعا جو ہر نبی کو دی جاتی ہے اُس کو بھی آپ نے اپنی امت کے لئے اٹھا رکھا ہے - میدانِ حشر میں جبکہ ہر شخص کو اپنی نجات کی فکر ہو گی - آپ اپنی امت ہی کی نجات کے لئے دعا فرماویں گے - اُمت ہی کی فلاح وصلاح وفوز ہی کی فکر میں آپ راتوں کو بہت کم سوتے اور روتے رہتے، قرآن شریف سے بھی امت کے لئے جذبات حبی سے آپ کا قلب مبارک معمور رہنا ثابت ہے -

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم (التوبہ)	بے شک تم میں ایک رسول آئے جو چیز تم کو مشقت میں ڈالتی ہے وہ ان پر بہت شاق ہے تمہاری ہدایت کے بہت آرزومند اور مومنین پر رؤف ورحیم ہیں -

یارب تو رحیمی و رسول تو رحیم   صد شکر کہ ہستیم میانِ دو رحیم

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی محبت واتباع کے بغیر ہمارے قلب میں نہ اللہ کی محبت پیدا ہو سکتی ہے اور نہ ہم اللہ کے محبوب ہو سکتے ہیں اور نہ ہمارا دین وایمان کامل ہو سکتا ہے حضرت رسالت پناہ سے محبت وگرویدگی کے معنی یہ ہیں کہ حتی الامکان علماً وعملاً آپ کی اتباع کی جائے اور تمام ذکر واشغال، عادات واطوار، وضع قطع آپ ہی کے طریقے پر ہوں آپ کا ارشاد ہے -

من احب سنتی فقد احبنی	جس نے میری سنت کو دوست رکھا مجھ کو دوست رکھا

آپ کی محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ آپ کی اتباع کو انسان اپنی عزت سمجھتا ہے آپ کی اتباع سے نہ وہ شرماتا ہے نہ گریز کرتا ہے، نہ جگ ہنسائی کا خیال ہوتا ہے عملاً و علاً آپکا اتباع جو اقتضا محبت ہے حق تعالیٰ کی محبت کا ثبوت ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (آل عمران)	کہیئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔

اللہ بزرگ و برتر اور اس کے رسولؐ کے احسانات پر جس قدر غور و فکر کیا جائے گا اسی قدر محبت ان سے زیادہ ہوتی جائے گی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ و رسولؐ کی خوشنودی ہر حال میں پیش نظر ہو جائے گی۔ اور تمام عالم سے محبت و بغض کا تعلق اللہ ہی کے تعلق سے قائم ہو جائے گا جو سب سے بہتر عمل ہے۔

افضل الاعمال الحب فی اللہ والبغض فی اللہ۔ (حدیث ابوداؤد)	تمام عملوں میں افضل عمل اللہ کے تعلق سے محبت اور اللہ کے تعلق سے دشمنی ہے۔

اللہ و اللہ کے رسول نے دین و کمال دین کی جو تعلیم دی ہے وہ یہی ہے کہ مومن کا قلب تمام مخلوقات، موجودات کی محبت سے خالی ہو کر اللہ و رسول کی محبت سے معمور و سرشار ہو چکا، دین و ایمان میں لذت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ معلم کتاب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ثلث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان من کان اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما ومن احب عبدا لایحبہ الا اللہ (الخ) (متفق علیہ)	تین خصلتیں ہیں جس میں وہ ہوں پائے وہ لذت ایمان کی۔ اللہ و رسول اس کے نزدیک ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جائیں جو ان کے سوا ہیں اور کسی کو نہیں چاہتا مگر اللہ کے لئے۔ (الخ)

ایک دفعہ آنحضرتؐ نے دریافت کیا کہ تم جانتے ہو کہ کونسا کام اللہ کو بہت زیادہ پسند ہے پھر خود ہی جواب میں فرمایا۔

ان احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ الحب فی اللہ والبغض فی اللہ (احمد و ابوداؤد)	بہت پسندیدہ عمل اللہ کے پاس دوستی خدا کے واسطے اور دشمنی خدا کے واسطے۔

دوسری حدیث جس کا تعلق کمال ایمان سے ہے۔

من احب للّٰہ وابغض للّٰہ واعطیٰ للّٰہ ومنع للّٰہ فقد استکمل الایمان۔
(ابوداؤد و ترمذی)

جس نے دوست رکھا اللہ کے واسطے اور دشمن جانا اللہ کے واسطے دیا اللہ کے واسطے نہ دیا اللہ کے واسطے تحقیق کامل کیا اس نے ایمان

خدا اور رسول کی محبت کے بغیر نہ بندۂ مومن مردِ مجاہد ہو سکتا ہے اور نہ صاحبِ عزیمت کتاب و سنت کی شہادت ہے کہ کمال ایمان یعنی قرب یہی ہے کہ حق تعالیٰ سب سے زیادہ محبوب ہو جائیں۔ پانچویں صدی ہجری کے مجدد حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ملاحظہ فرمایئے۔

اجتھد ان لا یبقیٰ شیٔ فی الدنیا تحبہ اذا تم ھٰذا فی حقک لا تترک مع نفسک لحظۃ۔ ان نسیت ذکرت و ان غفلت اوقظت۔ لا یدعک تنظر الی غیرہٖ فی الجملۃ۔ من ذاق ھٰذا فقد عرفہ۔ ھٰذا الجنس احاد افراد من الخلق (فتح ربانی مجلس ۱۱)

کوشش کر کہ دنیا میں کوئی چیز بھی تیری محبوب باقی نہ رہے۔ جب تیرے حق میں یہ مضمون کامل ہوجائیگا تو ایک لحظہ کے لئے بھی تو اپنے نفس کے ساتھ نہ چھوڑا جائے گا۔ اگر تو بھولیگا تو یاد دلا دیا جائے گا۔ غافل ہوگا تو بیدار کر دیا جائیگا۔ حق تعالیٰ تجھے نہ چھوڑیگا کہ تو غیر اللہ کی طرف نظر کرے جس نے یہ ذائقہ چکھا اس نے اس کی معرفت حاصل کی پس اس قسم کے افراد مخلوق سے بعض ہی ہوتے ہیں۔

پانچویں مجلسِ وعظ میں فرماتے ہیں کہ نسبتِ عبدیت صحیح ہونے کے بعد ہی حب و قرب کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

اذا صلحت عبودیتک لہ احبک وقوی حبک فی قلبک وانسک بہ وقربک بہ من غیر تعب ولا طلب لک صحبۃ غیرہٖ۔

جب تیری نسبت "غلامی" صحیح ہوجائے گی تو وہ تجھ سے محبت کریگا۔ اپنی محبت تیرے دل میں قوی کر دیگا اور تجھ کو اپنے سے مانوس بنا دیگا اور تجھ کو بلا مشقت اور بغیر اس کے کہ تیرے اندر صحبت غیر اللہ کی خواہش باقی رہے اپنا مقرب بنالے گا۔

قرآنی انبیائی سلوک بالکلیہ حبی سلوک ہے۔ فطری جذبۂ حب کی صحیح نسبت اور صحیح استعمال اور اس کی شدّت و قوّت کے بغیر بندگی اور کمال بندگی کا مقام حاصل نہیں ہو سکتا اللہ ورسول سے محبت پیدا کرنے کا طریقہ بھی کتاب وسنت کے مطابق ہونا چاہیئے، شریعت کا وقار ایسی ہی محبت سے قائم رہتا ہے کیونکہ یہ محبت گم سم کر دینے والی واویلا، آہ و فریاد کرنے والی محبت نہیں، بلکہ حق کی حفاظت، حق کی اشاعت، حق کا اعلان کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینے والی محبت، کتاب وسنت کی اتباع کے شوق میں ہر سب وشتم اور لعن طعن کو بطیب خاطر گوارا کرنے والی محبت، راہ حق میں ہر تلخی کو شیریں اور ہر زحمت کو رحمت، ہر تکلیف کو راحت سمجھنے والی محبت۔ حق کو حق، باطل کو باطل کہنے اور حق گوئی، حق بینی کا عزم و حوصلہ پیدا کرنے والی محبت، خدا ورسول کی رضا وخوشنودی کو تمام دنیا کی رضا وخوشنودی پر مقدم اور بہرحال خدا ورسول کی خوشنودی کو پیش نظر رکھنے والی محبت، مرضیِ حق کو اپنی ذات اور اپنے متبعین پر نافذ کرنے والی محبت ہوتی ہے۔

۵۔ ذکر۔ یاد، توجہ، یاد ہو یا توجہ دونوں کا تعلق دل سے ہے۔ زبان یا عمل اس کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ دل کی غفلت سے جو ذکر ہو وہ اپنے خواص و آثار کے لحاظ سے ذکر کی تعریف میں داخل نہیں۔ ذکر، محبت اور احسان کا اقتضا ہے جس سے انسان کو محبت ہوتی ہے اور جو انسان پر احسان کرتا رہتا ہے۔ انسان ہر وقت اس کی یاد اسی کے ذکر میں رہتا ہے۔ کوئی مشکل یا حاجت پیش آئے تو اس کی طرف توجہ کرتا ہے یہی فطرتِ انسانی ہے۔

اسی لئے صحیفۂ فطرت میں سب سے زیادہ ترغیب وتحریص اہل ایمان کو جس امر کی دلائی گئی ہے وہ ذکر اللہ ہی ہے۔

یاایھا الذین امنوا اذکروا اللہ ذکراً کثیراً (الاحزاب ع۶)	اے ایمان والو تم اللہ کو خوب کثرت سے یاد کرو ....

ذکر، جس کے لئے نہ کوئی مقام مخصوص ہے اور نہ نشست۔ بلکہ ہر وقت جاری و ساری ہو۔

فاذکروا اللہ قیاماً وقعوداً وعلیٰ جنوبکم۔ (نساء ۴)	اللہ تعالیٰ کی یاد میں رہو کھڑے بھی، بیٹھے بھی اور لیٹے بھی۔

ایسا ذکر کہ سننے والوں کے قلوب اللہ جل شانہ کی طرف مائل ہوں، اللہ جل شانہ کے فضل و احسان، عظمت و کبریائی سے متاثر ہو کر اللہ کی طرف رجوع کریں۔

فاذکروا اللہ کذکرکم اباءکم او اشد ذکراً۔ (بقرہ ۲۵)	اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو جس طرح تم اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے ہو۔ بلکہ یہ ذکر اس سے شدید ہو۔

یعنی جس طرح تم اپنے آبا واجداد کے ذکر سے سننے والوں کے قلوب پر اُن کی بڑائی وخوبی کا سکہ بٹھانا چاہتے ہو۔ اسی طرح اللہ جل شانہ کی رحمت، عظمت کا ذکر کیا کرو بلکہ اللہ کا ذکر اس سے بدرجہا بڑھ کر۔ تاکہ سننے والوں کے قلوب میں اللہ جل شانہ کی طاعت و بندگی کا شوق پیدا ہو۔ غرض جس کام کو اٹھتے بیٹھتے، کثرت سے، شدت سے کرنے کا حکم دیا گیا وہ ذکر اللہ ہی ہے۔ اب جس قدر مومن اللہ کی نعمتوں کا جو ہر آن اس پر نازل ہو رہی ہیں اور جن کو ہر آن استعمال کر رہا ہے۔ اپنے ادراک میں رکھے گا اتنی ہی اللہ سے اس کو محبت بڑھتی جائیگی۔ اور محبت میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا اسی قدر اللہ کا ذکر اس کی زبان پہ جاری رہے گا یہ فطرتِ انسانی ہے کہ جس سے اس کو محبت ہوتی ہے ہر وقت اسی کی فکر اور یاد میں لگا رہتا ہے۔

من احب شیئاً اکثر ذکرہٗ (حدیث)	جو کسی شے سے محبت کرتا ہے اکثر اس کا ذکر کرتا ہے۔

اللہ و رسولؐ سے محبت پیدا ہو جانے کے بعد اللہ و رسولؐ کا ذکر ایک تکلیف شرعی کے طور پر نہیں بلکہ ایک فطری عمل ہو جائیگا۔ احکام و ہدایات الٰہیہ پر عمل کرنا ذکر میں داخل ہے۔ حیرانی پریشانی اور مشکلات، مرادات و حاجات کے موقع پہ اللہ ہی کی طرف متوجہ

رہنا ذکر میں داخل ہے۔ اللہ کے احکام و ہدایات کو صبر و مرحمت کے ساتھ اللہ کے بندوں تک پہنچاتے رہنا اور ان کو اللہ سے وابستہ کرنے کی کوشش میں تحت کتاب و سنت مصروف رہنا، اشاعتِ دین و اعلائے کلمۃ الحق کا فرض انجام دیتے رہنا بہترین ذکر ہے جو اللہ جل شانہٗ کو سب سے زیادہ پسند ہے۔ اللہ کی آیتوں پر جو انفس و آفاق میں ہیں غور و فکر کرنا اور ان سے نصیحت حاصل کرنا ذکر میں داخل ہے۔ ہر فکر و عمل کے وقت آخرت کے نفع و ضرر کو ملحوظ رکھنا جس میں نفع آخرت ہے انھیں اختیار اور جس میں ضرر آخرت ہے انھیں ترک کرنا ذکر اللہ ہے۔ زندگی کے کاروبار میں اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا کہ حق تعالیٰ ہمارے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔ ذکر اللہ ہے۔ اور یہی وہ ذکر اللہ ہے جو انسان کو اپنے اعمال کا محاسب بنا دیتا ہے۔ جس کے بعد مومن اپنا آپ مصلح ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کی نظر اپنے ہی افکار و اعمال پر نہ ہو اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ سلوک مروجہ میں ابتداء ہی سے اپنی صورت اور ہر ایک کی صورت میں اللہ ہی کو مالک و حاکم و فاعل دیکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے اس لئے اس سلوک کے سالک اپنے اعمال کے محاسبہ سے بالکل غافل رہتے ہیں، کامل ہونے کے مدعی ہو جاتے ہیں بگر صالحیت بھی ناقص رہتی ہے۔ حالانکہ قرآنی تعلیمات میں انفس و آفاق کا احتساب ہے وہ تعلیم قرآنی نہیں ہو سکتی جس میں احتسابِ کائنات کے بجائے

"دیکھ میں دیکھ ایسا دیکھ

دیکھتا دکھتا ہوئے ایک"

کی مشق کرائی جاتی ہے اور اس کو بہترین ذکر و شغل کہا جاتا ہے جس ذکر و شغل سے انسان میں اپنی اور اپنے متعلقین کی اصلاح کا شعور اور اعلائے کلمۃ الحق کا جذبہ پیدا نہ ہو وہ مجمی ذکر ہے قرآنی نہیں۔ ذکر کی جزاء۔

تم میری یاد میں رہو میں تمہاری طرف متوجہ رہتا ہوں	فاذکرونی اذکرکم (سورہ بقرہ)

ارشاد ہو رہا ہے کہ تم جس موقع پر جس حیثیت سے میری طرف متوجہ رہو گے یا مجھ کو یاد رکھو گے میں اس موقع پر اسی مناسبت سے تمہاری طرف متوجہ رہوں گا۔ تمہاری مدد کروں گا وغیرہ۔

ذکر کے کثیر فوائد ہیں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اکثروا ذکر اللہ حتیٰ یقولوا مجنون (حدیث صحیح ابن حبان) تم اللہ کا اتنا ذکر کرتے رہو کہ لوگ تم کو مجنون کہیں۔

ہر کام کے آغاز پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنا اور زندگی کے کاروبار کے سلسلہ میں جو دعائیں مروی ہیں ان پر عامل ہونا ذکر اللہ ہے۔ غرض اللہ سے محبت ہونے، ہر نعمت کو من اللہ سمجھنے اور تعلق باللہ قائم ہونے کی علامت ذکر اللہ ہے۔

دیکھا جاتا ہے کہ ذکر کے بہت سے ایسے طریقے رائج کئے گئے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام کی تعلیمات نہیں اگرچہ رائج کرنے والوں نے تعلق باللہ قائم کرنے کی نیت سے طریقے ایجاد کئے۔ لیکن جو حکم قرآن مجید میں ہے وہ تو یہ ہے۔

واذکروہ کما ھداکم (بقرہ ع ۲۵)	اور اس کی یاد اس طرح کرو جس طرح ہدایت کی گئی ہے
فاذکروا اللہ کما علمکم (بقرہ ع ۳۱)	خدا کی یاد اس طریق سے کرو جیسا تم کو تعلیم دی گئی ہے۔

ان دونوں آیتوں کا تعلق نماز سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خیر و برکت جو کتاب و سنت کے اعتصام میں ہے وہ کسی اور طریق میں نہیں تعلق باللہ قائم کرنے والوں کے لئے قرآن کریم میں جس طریقہ ذکر کی تعلیم ہے وہ صرف نماز ہے چنانچہ نماز ہی کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے۔

ولذکر اللہ اکبر (سورہ عنکبوت پ۲۱)	بے شک اللہ کا ذکر بڑی نعمت ہے۔

غرض ذکر جو محبت کا نتیجہ ہے ایک ایسی دولتِ عظمیٰ اور نعمت بے بہا ہے کہ اس کے ذریعہ مومن اللہ کے فضل و خصوصی رحمت کا مستحق ہوتا جاتا ہے اور اللہ جل شانہ سے شیفتگی و گرویدگی بڑھتی جاتی ہے۔ تعلق باللہ میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ قہر و عتاب کی نسبتیں اس سے منقطع ہو جاتی ہیں۔ نفس کا تزکیہ اور قلب کا تصفیہ ہوتا رہتا ہے جمعیتِ خاطر

اور طمانیتِ قلبی بھی حاصل رہتی ہے ۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (الرعد) | بے شک اللہ ہی کے ذکر سے دل کو اطمینان رہتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ جل شانہٗ کا ذکر ہے ۔ انسان کی فطرت اور انسان کی سعادت و شقاوت کا ذکر ہے ۔ انسان کی عارضی و ابدی زندگی کا ذکر ہے یہ تینوں ذکر لازم و ملزوم ہیں

۶ توکل (اعتماد و بھروسہ) جب انسان کسی ہستی کو اپنے لئے ہمہ خیر و فلاح ہمہ رحمت و مؤدّت سمجھ کر اس پر کامل بھروسہ رکھتا ہے تو اس کو توکل کہتے ہیں ۔

قرآن شریف کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار میں تجاویز حق کو اختیار اور ان پر بلا لحاظ نتائج عمل کرنے کا نام توکل ہے ۔ کیونکہ مقصود اصلی اخروی زندگی کی تعمیر ہے اور جو اعمال یہاں سرزد ہو رہے ہیں وہ اس کی تعمیر کے اجزاء ہیں اس لئے نتائج اس عالم میں انسان کی مرضی کے مطابق ہوں یا مرضی کے خلاف ۔ جو اعمال تحت امر الٰہی بہ سلسلہ کاروبار سرزد ہوتے ہیں ان سے ابدی زندگی کی تعمیر قطعی، یقینی ہے ۔ اس لئے یہاں کے نتائج کے تعلق سے کوئی حیرانی و پریشانی اور خوف و حزن قلبِ مومن میں نہیں پیدا ہوتا ۔ تدابیر تحت شریعت اختیار کرنے کے بعد بلحاظ نتائج اللہ جل شانہٗ پر اعتماد اور بھروسہ کرنا کہ اب جو نتائج رونما ہونگے وہ قطعاً ہمارے لئے موجب خیر و فلاح ہونگے، اصلی توکل ہے حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی محافظ و نگہبان ہیں ۔ کارساز و کارفرما ہیں ۔ شر و آفات سے وہی حفاظت کرنے والے ہیں ۔ مشکلات کو وہی آسان کرنے والے ہیں اور نتائج جو کچھ پیدا ہوتے ہیں وہ سعی و تدبیر سے نہیں بلکہ سعی و تدبیر کے بعد حق تعالیٰ ان نتائج کو پیدا کرتے ہیں ۔ انسان صرف سعی عمل پر مکلف ہے ۔ بدل سعی و عمل عطا کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے پس اعتماد و بھروسہ کے قابل اللہ تعالیٰ ہی ہیں نہ کہ سعی و تدبیر، نہ کوئی فرد خلق، ۔ اس لئے یہی حکم ہے ۔

وتوکل علی اللہ وکفیٰ باللہ وکیلا ۔ (الاحزاب ع۱) | اللہ پر بھروسہ رکھ اللہ کافی کارساز ہے ۔

اس آیتہ کریمہ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جل شانہ پر بھروسہ رکھ کر ان کے احکام وہدایات پر کاربند رہو، زندگی کی ہر کروٹ اور انقلاب کے موقع پر جو حکم خدا ورسول ہے اس پر جمے رہو کیونکہ ہر حکم وہدایت خیر و رحمت ہے اس کے بعد جو نتائج حق تعالیٰ پیدا کریں گے وہ تمہارے ہی لئے موجب صلاح وفلاح ہیں۔

جزائے توکل۔ ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہٗ (ترجمہ) جو اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ (حل مشکلات کے لئے) کافی ہیں۔ (الطلاق ع ۱)

مطلب یہ ہے کہ مشکلات آسان کر دی جائیں گی۔ شرور وآفات سے حفاظت کی جائیگی اگر خیر ہے تو کاروبار انسان کی مرضی کے مطابق انجام پائیں گے، اگر نتائج خلاف مرضی ہونگے تو قلب میں اضطراب و بے چینی، حیرانی وپریشانی پیدا نہ ہوگی۔

انسان کو کوئی حاجت یا ضرورت یا مشکل پیش آتی ہے تو اس وقت انسان کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس کے پاس کماحقہٗ اسباب رہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ اسباب پورے نہیں رہتے۔ پہلی صورت میں اسباب اختیاری کو شریعت کے احکام کے مطابق کام میں لانا بلالحاظ نتائج توکل ہے۔ دوسری صورت میں جب کہ اس کے پاس اسباب ظاہری پورے نہ ہوں تو جتنے اسباب ہوں ان کو کام میں لائے اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے اپنی حالت کو اللہ کے سامنے پیش کر دے، توکل کے بعد حق تعالیٰ کافی ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ حق تعالیٰ اسباب پیدا کر دیں گے اور حاجت وضرورت پوری ہونے کا انتظام فرما دیں گے یا ضرورت وحاجت پوری نہ ہو تو قلب مومن کو حزن و غم میں مبتلا نہ رہنے دیں گے۔ اگر نتائج منشاء کے مطابق ظاہر ہوں گے تو شکر کی توفیق عطا فرما دیں گے۔ کمال توکل یہ ہے کہ کاروبار میں افکار و آلام سے قلب محفوظ رہے اور سکون وطمانیت نصیب ہو خلاصہ یہ ہے کہ ترک اسباب توکل نہیں ہے بلکہ اسباب اختیاری کو حتی المقدور بامتثال امر الٰہی کام میں لانا توکل ہے۔

۷۔ طلب امداد، دعا:۔ دعا کے معنیٰ ہیں طلب ومانگ، حاجت یا مشکل پیش آنے پر حاجت روا

اور مشکل کشا کے آگے اُس کو نہایت ادب ، منت و عاجزی کے ساتھ پیش کرنا اور اس سے اپنا مقصود طلب کرنا دعا ہے جو عین عبادت ہے مغز عبادت اور مقصد عبادت ہے یعنی عبد و رب کے قلبی تعلق کی علامت ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الدعاء هو العبادة (حدیث)	دعا ہی عبادت ہے۔

ایک اور ارشاد مبارک ہے۔

الدعاء مخ العبادة (حدیث)	دعا مغز عبادت ہے

دعاء کی تاثیر آپ نے یہ بیان فرمائی۔

لا یرد القضاء الا الدعاء (حدیث)	دعا ہی قضا کو رد کرتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ قضاء اگر رد ہو سکتی ہے تو دعا ہی کے ذریعہ رد ہو سکتی ہے۔

اجابتِ دعا کے متعلق ایک غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم جو مانگیں اور دعا کریں وہی مل جائے۔ بالفاظِ دیگر حق تعالیٰ ہمارے تابع ہو جائیں۔ حالانکہ حق تعالیٰ حکیم و خبیر ہیں اور بندہ اپنے حقیقی نفع و ضرر سے لاعلم ہے۔ دعا کرنا بہرحال لوازمۂ عبدیت ہے اجابتِ دعا کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر دعا میں دنیوی اور دینی ضرر نہ ہو تو بعینہٖ فوری یا بدیر قبول کی جائیگی یا اُس دعا کی وجہ سے آنے والی مصیبتیں دفع کردی جائیں گی یا دعا ذخیرۂ آخرت کر دی جائیگی۔ ان معنیٰ میں بندۂ مومن کی ہر دعا قبول ہو رہی ہے۔ غرض کاروبار میں دعا کی توفیق اور اجابتِ دعا کا صحیح مفہوم ایک خاص نعمتِ حق ہے جو ہر مانگنے والے کو عطا کی جاتی ہے۔

کائنات میں جو حرکت و تغیر ہے وہ اذن و ارادۂ الٰہی سے ہے حرکت و تغیر کے بعد اشیاء کے جو آثار و خواص ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی اذن و ارادۂ الٰہی سے ظاہر ہوتے ہیں اس لئے استعمال اشیاء کے بعد نتائج حسب مرضی پیدا ہونے کے لئے حق سبحانہٗ تعالیٰ سے معروضہ، دعا کرنا، سعادتِ انسانی ہے۔ سعی و عمل اور بدلِ سعی و عمل ان معنی میں لازم

وملزوم نہیں ہے کہ سعی وعمل کا لازمی نتیجہ بدل سعی وعمل ہو۔ محنت کے بعد بدل محنت عطا کرنا حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگرچہ محنت کے بعد ہی بدل محنت عطا کیا جاتا ہے لہذا سعی و عمل کے بعد بدل سعی وعمل عطا کرنے کے لئے دعا ضروری ہے۔ اسی طرح قانونِ مغفرت پر عمل پیرا ہونے یعنی ایمان وعمل صالح کے بعد دعائے مغفرت لازمی ہے۔ دعا کے قرآنی آداب یہ ہیں۔

وادعوہ خوفاً وطمعاً (الاعراف) | اور اس سے دعا کرو ڈرتے ہوئے اور امید رکھتے ہوئے

پہلا ادب یہ ہے کہ دعا خوف و امید کی حالت سے کی جائے خوف یہ کہ کہیں یہ معروضہ مرضی رب کے خلاف یعنی میرے لیے مضر تو نہیں ہے۔ اور امید یہ کہ حق تعالیٰ اگر مضر نہ ہو تو ضرور قبول فرمائیں گے۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ دعا میں رقت قلبی ہو عاجزی ومنت ہو۔

ادعوا ربکم تضرعاً وخفیۃ (الاعراف) | اپنے رب سے دعا کرو عاجزی وذلت آہستہ سے۔

صلاح وخیر، فلاح دارین اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے اس لیے صلاح وفلاح کیلئے ہر وقت اللہ جل شانہٗ سے دعا کرتے رہنا چاہیئے یہی شیوۂ بندگی ہے یہی شعار عبدیت ہے محض ایمان وعمل پر بھروسہ نہ کرنا چاہیئے۔

اللہ جل شانہ، کو مالک وحاجت روا اور مستعان تسلیم کرنے کے بعد ممکن نہیں کہ مومن اللہ کے سوا کسی اور کے آگے اپنی حاجات ومراد کو پیش کرے دفع مصائب وحل مشکلات کے لئے کسی اور کو مدد کے لئے پکارے اور طلب امداد کے لیے کسی اور کے آگے ذلت و عاجزی کا اظہار کرے۔ بزرگان دین، اولیاء اللہ نے بھی اس سے منع کیا ہے اس تعلیم کے خلاف بزرگوں کو مستعان سمجھ کر ان سے مدد طلب کرنا اور مصیبتوں میں ان کو پکارنا ان کی مقدس روحوں کو تکلیف دینا ہے۔ یہ اولیاء اللہ سے محبت نہیں، دشمنی وعداوت ہے ان کا احترام نہیں بلکہ ان کی تعلیمات کی تحقیر ہے۔ جو اللہ کا ولی ہے وہ ہرگز ایسی تعلیم

نہیں دے سکتا کہ حقیقی حاجت روا جو باغراض حاجت روائی قریب ہے تائید و مدد کے لئے ساتھ ہے اس سے مدد طلب کرنے کے بجائے مخلوق کو پکارا جائے۔ خالق کو چھوڑ کر مخلوق سے استعانت کی جائے۔" حضرت معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

واذا سألت فاسأل اللّٰہ واذا استعنت فاستعن باللّٰہ۔ (حدیث)	اور جب تو سوال کرے تو اللہ ہی سے کرے اور مدد مانگے تو اللہ ہی سے مدد مانگے۔

کتاب و سنت کی اس قدر واضح تعلیم کے بعد اللہ کے سوا بزرگان دین کو مدد کے لیے پکارنا اور اس عمل کو جائز یا بابرکت قرار دینا قرآن و سنت و عمل صحابہ سے کھلا انحراف ہے۔

اللہ جل شانہٗ کا در ہی وہ در ہے جہاں صد ہزار بار مانگنے میں بھی ذلت نہیں، عزت ہی عزت ہے جہاں مانگنے میں محرومی نہیں، عطا ہی عطا ہے۔ اضطراب نہیں سکون ہی سکون ہے۔

۸۔ اطاعت و انقیاد:۔ خوف و رجا، صبر و رضا، شکر، محبت، ذکر، توکل، دعا، حق تعالیٰ سے بندہ کے یہ وہ قلبی تعلقات ہیں جن کا اقتضاء انقیاد و اطاعتِ حق ہے۔ قلبی تعلق کے اظہار کا ذریعہ عمل ہی ہوتا ہے اور عمل ہی سے قلبی تعلق میں پختگی پیدا ہوتی ہے اسی لئے فرمایا گیا۔

اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول ان کنتم مومنین (انفال ع۱)	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

ایمان باللہ یہ ہے کہ جذباتِ خوف و حب وغیرہ کا تعلق حق تعالیٰ سے قائم ہو جائے اصلی ایمان یہی ہے اور ایمان کا اقتضاء اطاعت و سرافگندگی ہے، تسلیم و سپردگی ہے، اور یہی وہ اسلام ہے جو عند اللہ مقبول ہے، جس کے بعد ذلت نہیں عزت ہے، پستی نہیں سربلندی ہے، حیرانی و پریشانی نہیں، سکون و اطمینان ہے۔ فتنہ و فساد نہیں امن و سلامتی ہے۔ ابدی سرور و شادمانی ہے۔ دین اسلام کو قبول و اختیار کرنے کا مطلب یہی ہے کہ زندگی سرتاپا بندگی ہو جائے تاکہ آخرت کی زندگی بہتر سے بہتر ہو۔ اگر ماحول اس کے خلاف

ہے تو سکون و اطمینان کے ساتھ ماحول سے تعاون نہ ہو، بلکہ کراہیتِ قلبی ہو اور ماحول کے خلاف قولاً و فعلاً جد و جہد جاری رہے، مخالف ماحول کے زمانہ میں اگر مومن کی زندگی مجاہدانہ زندگی نہ ہو تو ضعف ایمان ہے جو نقص ہے اور فطرۃً انسان نقص کو پسند نہیں کرتا وہ کمال کو پسند کرتا ہے اور کمال کا طالب ہے اور اگر باطل ماحول سے چاہے وہ اپنے گھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو، کراہیت و مخالفتِ قلبی نہ ہو تو ایمان مشتبہ ہے۔

زندگی سرتاپا بندگی ہو جانے کے لئے دینِ فطرت میں چار بنیادی اعمال ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج۔ مگر شعورِ بندگی تازہ رکھنے کے لئے ان تمام اعمال میں نماز ہی ایک ایسا عمل ہے جو امیر و غریب، مرد و عورت، غلام و آزاد، سب کے لئے یکساں ضروری ہے۔ زکوٰۃ، روزہ حج کی طرح امارت یا مخصوص مہینے و حالات پر مشروط نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ کے ذریعہ بندگی کا جو علم بخشا گیا ہے۔ نماز اس کی عملی مشق ہے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بطورِ خاص اس کی تعلیم دی ہے اور اس کے خیر و برکات بیان فرمائے ہیں۔ صحابہ کرام کی زندگیوں میں یہی عمل نمایاں نظر آتا ہے۔ یہی وہ ذکر ہے، یہی وہ عمل ہے جس سے تزکیہ نفس بھی ہوتا ہے اور تصفیۂ قلب بھی۔ صحیح نسبتِ الٰہیہ اور صحیح تعلق باللہ فکری و عملی حیثیت سے اگر قائم ہو سکتا ہے تو اسی عمل الصلوٰۃ ہی سے قائم ہو سکتا ہے۔ نسبتِ الٰہیہ کے لئے دیگر اشغال اور طریقوں کو اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ الصلوٰۃ کی افادیت پر یقین نہیں کیا گیا۔ ورنہ جس ذکر و عمل کے متعلق حضرت معلّم کتاب صلی اللہ علیہ وسلم یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ یقین رکھو کہ تمہارے اعمال میں بہتر عمل نماز ہی ہے۔

واعلموا ان خیر اعمالکم الصّلوٰۃ (احمد و ابن ماجہ)

جس کو نور فرمایا گیا ہے۔

الصّلوٰۃ نورٌ (مسلم)

اور جس کو مؤمنین کے لئے معراج فرمایا۔

الصّلوٰۃ معراج المؤمنین (حدیث)

ایک قرآنی و انبیائی عمل سے نسبت الٰہیہ، تعلق باللہ قائم کرنے کے بجائے دیگر اعمال و اشغال کو اس مقصد کے لئے رائج کرنا اللہ محفوظ رکھے رسالت کو ناقص سمجھنا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بنیادی اعمال کو زندگی کی تعمیر سے کیا ربط و مناسبت ہے مختصراً بیان کر دیا جائے۔

نماز۔ بندگی کا ادراک اور اقرارِ الوہیت کا اظہار ہے۔ طہارت و پاکیزگی کے التزام کے بعد اپنے رب کے حضور میں فقیرانہ و عاجزانہ انداز سے حاضر ہو کر اقرار بندگی، پیمان سجودگی تجدید کی جاتی ہے عرض کرتے ہیں کہ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور بلا واسطہ و ذریعہ آپ ہی سے امداد مانگتے ہیں۔ یعنی اپنی فلاح و خیر میں آپ ہی کی توجہ و امداد کے محتاج ہیں استدعا کرتے ہیں کہ اس صراطِ مستقیم پر ہم کو لے چلئے جس کی منزل فردوس بریں ہے۔ وہی آپ کی ابدی خوشنودی و رضا کے ظہور کا مقام ہے۔ اپنے ان بندوں کے اتباع و تقلید کی توفیق دیجئے جن کو آپ نے انعامات خاصہ سے سرفراز فرمایا ہے۔ دین و ایمان پر استقامت صدق فی الایمان، بصیرتِ قرآنی، جرأت و فراستِ ایمانی، اللہ تعالیٰ و رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے محبت و گرویدگی، ان کی اطاعت و فرماں برداری، اہل حق سے محبت، مخالفِ حق سے بغض، حسنات کی رغبت، سیئات سے نفرت، حق پہ قائم رہنے اور حق کو قائم کرنے کے لئے دنیا کا ہر نقصان گوارا کرنے کی ہمت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عزم و حوصلہ، نامرضیات میں صبر و رضا، مرضیات میں شکر، معاملات میں توکل، مشکلات و حاجات میں آپ ہی سے دعا، استعانت، گناہ و لغزش پہ توبہ و انابت، مخلوق سے بے خوفی و ناامیدی اور آپ ہی سے خوف و رجاء، ہر حرکت و سکون میں آپ ہی کے فضل و رحمت پر نظر، اس عالم میں یہی آپ کے انعامات خاصہ ہیں التجا ہے کہ یہ انعامات خاصہ ہم کو بھی سرفراز فرمائے

اور اس طرح سے سرفراز فرمائیے کہ پھر ہم آپ کے قہر و غضب کے مستحق نہ ہوں اور نہ گمراہ ہوں، سر افگندہ ہوکر قدموں پر سر رکھ کر عبدیت و بندگی کا والہانہ اظہار کرتے ہیں اور اپنے معروضہ کی قبولیت کا پروانہ لے کر ہی اٹھتے ہیں۔

نماز بارگاہِ رب العزت میں حاضر ہوکر رب اعلیٰ و عظیم سے صلاح و خیر و فلاح کی ایک مؤدبانہ درخواست ہے۔ رحمٰن و رحیم سے رحمت و مودت کی طلب ہے مالک یوم الدین سے نجات و مغفرت کی استدعا ہے۔ ہدایت دینے والے سے بندگی کے عہد و پیمان پر قائم اور سرکشی و گمراہی سے محفوظ رکھنے کا معروضہ ہے، ایک فقیر بے نوا، اپنے حقیقی منعم و معطی اللہ عزّ وجلّ کے آگے سرنگوں ہوکر قدموں پر سر رکھ کر بھیک مانگتا ہے۔ اس ادراک و دانش سے جو نماز پڑھی جائیگی اس میں خشوع بھی ہوگا اور حضورِ قلب بھی۔ ایسی ہی نماز سے فکر و عمل کی گندگی دور ہوتی ہے۔ بندگی کا شعور قائم رہتا ہے۔ اور بندگی کے اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے

زکوٰۃ۔ زر و مال ہی سے انسان کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی ہیں وہ عموماً انسان کے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی محبت انسان کے دل و دماغ پر غالب رہتی ہے۔ انسان کو اس کا ہاتھ سے نکالنا گوارا نہیں ہوتا۔ اس کی محبت حقوق ادا کرنے سے روکتی ہے۔ لیکن کوئی بہتر اور نہایت نفع بخش بدل مطلوب و مقصود ہو تو اس متاعِ عزیز کو بھی وہ بطیبِ خاطر خرچ کر دیتا ہے۔ مومن کا مقصد صرف رضائے حق، بدل و درجاتِ آخرت ہے۔ جس کی وجہ سے تحت حکم حقوق واجبہ کی ادائی میں زر و مال کا ایک مقررہ حصہ خرچ کرنا گویا اس کا اپنا ذاتی مفاد ہے جو حقیقتاً خرچ نہیں نفع کے ساتھ جمع ہے۔ یہ مقصد پیش نظر رہنے سے قلب حُبِّ مال نمود و شہرت اور دوسروں پر احسان جتانا جیسے مہلک و گندے جراثیم سے پاک ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ سے کردار میں بھی پاکیزگی اور طہارت پیدا ہوتی ہے دیگر نفل

صدقات کا بھی یہی منشا ہے۔

یوتی مالہ یتزکیٰ (سورہ واللیل)	مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو۔

زکوٰۃ اور صدقات کا اسلامی فطری نظام ہی بے روزگاری اور غربت و سرمایہ داری کی کشمکش کا واحد قدرتی علاج ہے۔

روزہ = کھانے پینے کے اوقات میں صرف ایک تبدیلی ہے۔ دن کے بجائے رات کے اوقات مقرر کیے گئے ہیں تاکہ جائز خواہشات پہ قابو پانے کی ہر سال مشق کرتے رہنے سے انسان ناجائز خواہشات پر قابو پانے کے قابل بنا رہے آخرت کے نقصان سے محفوظ رہنے کی یہی صورت ہے کہ ناجائز خواہشات سے اجتناب کیا جائے نیز مومن مرد مجاہد ہوتا ہے۔ راہ حق میں بھوک و پیاس کی تکلیف برداشت کرنے کی عادت نہ ہو تو معرکۂ حق و باطل کا وہ مرد میدان نہیں ہو سکتا دین و ایمان کی حفاظت و بقا اور دین کی اشاعت کے سلسلہ میں بسا اوقات فقر و فاقے کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ اگر مومن کو اس کی عادت نہ ہو تو وہ جہاد فی سبیل اللہ سے گریز کرتا رہے گا۔ جس میں ضررِ آخرت ہے، تقویٰ یہی ہے کہ انسان ضررِ آخرت سے بچتا رہے اور نفع آخرت حاصل کرنے میں پیش پیش رہے۔ روزہ کا یہی مقصد ہے۔ چنانچہ فریضہ صوم کے سلسلہ میں ارشاد ہے۔

لعلکم تتقون۔ (البقرۃ)	تاکہ تم پرہیزگار رہو۔

روزہ میں نفع آخرت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ بھوک و پیاس کی حالت میں انسان میں عاجزی مسکینی، الحاح وزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور نادار انسانوں کے فقر و فاقے کی تکلیف کا احساس اور ان سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے بندہ کے یہ اوصاف حق تعالیٰ کو بہت پسند ہیں اور بندہ کو زیادہ سے زیادہ رحمتِ حق کا مستحق بناتے ہیں۔ غالباً اسی لئے رمضان میں ہر عبادت کا اجر بہت زیادہ ہے اور جزائے آخرت

بھی مخصوص۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔

للصائم فرحتان فرحة عند فطره وفرحة عند لقاء ربه۔	روزہ دار کو دو خوشیاں ہوتی ہیں ایک افطار کے وقت دوسری رب کی ملاقات کے وقت

لقاء رب کی مسرت روزہ ہی کا ایک خصوصی اجر ہے۔ عرفانِ مروجہ کے بعض عارف روزہ کو حق تعالیٰ کی صفتِ صمدیت سے مشابہ ہونا سمجھتے ہیں۔ یہ مہمل بات ہے۔ ایک بھوکے پیاسے انسان کو صفتِ صمدیت سے مشابہ قرار دینا عرفانِ مروجہ کی اس بنیادی غلطی کا نتیجہ ہے جس میں توحید یہ ہے کہ بندہ اور خدا کے صفات ایک ہیں یا بندہ کی صورت میں خدا ہی موجود ہیں۔ ایسی بے ادبی سے خدا محفوظ رکھے۔ جس عبادت کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں بندۂ حق اور بندۂ جاں نثار کے اوصاف عاجزی، مسکینی اور بھوک و پیاس برداشت کرنے کی قوت پیدا ہو اس عبادت کی حقیقت یہ بیان کرنا کہ حق تعالیٰ کی صفت صمدیت سے مشابہت پیدا کرنا مقصود ہے۔ کتنی غیر سنجیدہ بات اور قرآنی دعوت سے کتنی ناواقفیت کی علامت ہے۔ روزہ بڑی پر لطف عبادت ہے کھانا بھی عبادت اور نہ کھانا بھی عبادت، دن کے اوقات میں نہ کھانا عبادت ہے اور شام کے اوقات میں کھانا پینا عبادت

حج = یہ عبادتِ اہلِ ثروت سے مخصوص ہے۔ جنکی زندگی فارغ البالی کی وجہ سے راحت و آرام میں گزرتی رہتی ہے۔ وہ تکالیف کے خوگر نہیں ہوتے، آرام طلبی کا مرض مومن کے لئے جو مرد مجاہد ہوتا ہے۔ ضرر رساں ہے۔ حج اس مرض کا علاج بھی ہے اور گھر بار اہل و عیال دوست احباب کے تمام تعلقات سے منہ موڑ کر ایک مخصوص مقام پر سفر کے تمام تکالیف کو برداشت کر کے حاضر ہونا اور عادات معمولہ سے زائد عبادات مثلاً طواف و سعی میں مصروف رہنا خدا و رسول کی محبت کے اظہار کا ایک والہانہ طریقہ بھی ہے۔

عمر بھر میں ایک بار یہ عبادت خدا اور رسول کی محبت کے جانچنے کی ایک ایسی کسوٹی ہے کہ کھرا اور کھوٹا الگ الگ کر دیا جاتا ہے حج کرنے والے اس معیار پر پورے اترے بغیر تکمیل ایمان کے مراتب نہیں طے کر سکتے۔

دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے ایک ہی خدا کے پرستار، ایک ہی دامن رحمت سے وابستہ، ایک ہی شمع کے پروانے، ایک ہی در کے بھکاری، ایک ہی جمال حق کے دیوانے، کشاں کشاں ایک ہی مقام پر، ایک ہی لباس، ایک ہی وضع قطع سے حاضر ہو کر ایک رشتۂ اخوت و محبت میں جڑے ہوئے دُرہائے آبدار ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، سبحان اللہ کیا اچھی عبادت ہے۔

اس فریضۂ کی ادائی میں گھر سے نکل کر گھر واپس ہونے تک قدم قدم پر کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ مجنوں ہوئے بغیر اس پرُخار وادی سے انسان نہیں گزر سکتا۔ شوق کعبہ کے بغیر راستے کے کانٹوں کی سرزنش بطیب خاطر گوارا نہیں کی جا سکتی۔ اس لئے حضرت معلم حکمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاجی اور مجاہد کا ذکر ایک ساتھ فرمایا۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ شریف کتاب مناسک۔

۹۔ توبہ و استغفار۔ جب انسان سے کوئی غلطی یا قصور ہو جاتا ہے تو وہ نادم ہوتا ہے۔ اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے اور آئندہ غلطی نہ کرنے کا عزم کرتا ہے اور اس غلطی کی تلافی کی کوشش کرتا ہے اور اپنے قصور کی معافی چاہتا ہے اس فطری جذبہ کا نام قرآن میں توبہ و استغفار ہے۔ کوئی شخص غلطی عمداً سوچ سمجھ کر نہیں کرتا، غلطی ہمیشہ نادانی، سہو، کسی خوف و فوری تحریص و ترغیب سے ہو جاتی ہے۔ ایسی غلطی کا نام معصیت، گناہ ہے۔ اگر کوئی بُرا کام سوچ سمجھ کر صرف دنیا کے لئے، ضرر آخرت سے بے پروا ہو کر کیا جائے جو خدا تعالیٰ سے بے خوف ہونے کی علامت ہے تو یہ اکتساب معصیت ہے۔ سرکشی ہے، از قسم کفر ہے، شرک ہے، نفاق ہے، سوچ سمجھ کر یا بطور پیشہ کسی معصیت

کو اختیار کرنا اور اس کے ترک پر آمادہ نہ ہونا تقاضائے ایمان نہیں ہے۔ غرض ایک تو سہواً جہالت سے معصیت کا صادر ہو جاتا ہے اور ایک اکتساب معصیت ہے۔ صدور معصیت اقرار عبدیت کے منافی نہیں ہاں اکتساب معصیت اقرار عبدیت کے منافی ہے۔ توبہ ان ہی لوگوں کی قبول ہوتی ہے جو سہواً یا جہالت سے کوئی برا کام کر بیٹھتے ہیں اور فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔

انما التوبة على الله للذين يعملون السوء بجهالة ثم يتوبون من قريب فاولئك يتوب الله عليهم (النساء)

توبہ جس کو اللہ تعالیٰ قبول کرتے ہیں ان کی ہے جو برا کام نادانی سے کرتے ہیں پھر جلدی ہی توبہ کرتے ہیں بیشک ان ہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ رحم فرماتے ہیں۔

توبہ کے چار اجزا ہیں۔ اعتراف قصور، ندامت (پچھتاوا) ترک معصیت اور آیندہ نہ کرنے کا پختہ عزم۔ عفو و مغفرت کی طلب۔ ان چار اجزاء سے توبہ مکمل ہوتی ہے اگرچہ اطاعت و انقیاد، تسلیم، مقتضیات عبدیت ہیں۔ لیکن قصور و غلطی بھی بندہ ہی سے ہوتی ہے اور اعتراف و شرمندگی بھی بندگی کا اقتضا ہے۔ بندگی یہی ہے کہ قصور ہوتے ہی توبہ کی جائے۔ فوری توبہ کی توفیق ان لوگوں کو نہیں ہوتی جو سوچ سمجھ کر مفاد دنیا کے تعلق سے معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں اللہ کی غفاریت و رحیمیت، توبہ کرنے والے ہی سے متعلق ہوتی ہے۔

واستغفروا الله ان الله غفور رحيم

اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہو اللہ غفور و رحیم ہے۔

توبہ میں دراصل اپنی عاجزی و مسکینی و ذلت کا اظہار ہے حق تعالیٰ کو اپنے بندوں میں عاجزی و مسکینی بہت پسند ہے بندہ گناہ کرنے کے بعد نادم ہوتا ہے اور اپنے پر ملامت کرتا ہے اور حق تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ بجز حق تعالیٰ کے میرے گناہ کوئی معاف کرنے والا نہیں۔ بندہ کا یہ عمل چونکہ علم و دانش حق کے موافق و مطابق ہوتا ہے اور مخالفت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے رحمت حق متعلق ہو جاتی ہے اور گناہ سے

جو ظلمت پیدا ہوئی تھی وہ دور کر کے نورانیت پیدا کر دی جاتی ہے اس لئے ارشاد باری ہے

ان اللہ یحب التوابین ۔ (البقرہ)	اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں ۔

محرومی رحمت کا خوف ہی توبہ کا محرک ہوتا ہے۔ محرومی رحمت کا خوف نہ ہو تو گناہ کا احساس بھی نہیں ہوتا ۔

گناہ کے حقیقی اعتراف میں جس کی علامت یہ ہے کہ گناہ کے بعد دل میں خوف پیدا ہو، اللہ کی حقیقی مالکیّت وحاکمیت کا اقرار پوشیدہ ہے اور گناہ سے ندامت میں اپنی بندگی و عاجزی کا ادراک ہے ان ہی دو چیزوں سے عبودیت صحیح ہوتی ہے اور ایمان درست ہوتا ہے ۔

محض زبان سے "استغفراللہ" کہہ دینا جب کہ قلب اعتراف قصور، ندامت وخوف سے خالی ہو توبہ کی تعریف میں داخل نہیں ۔ دین کے تمام امور کا تعلق قلب سے ہے جیسے زندگی کے دیگر کاروبار توجہ قلبی کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتے اسی طرح دینی امور کی انجام دہی کے وقت اگر قلب متوجہ نہ ہو تو ایسے ذکر وعبادت میں کوئی خوبی نہیں اور نہ اس سے نفس کا تزکیہ ہو سکتا ہے۔ توبہ کے بعد ترکِ معصیت یعنی اصلاحِ عمل ضروری ہے ورنہ وہ توبہ نہیں ۔

انہ من عمل منکم سوءً بجھالۃ ثم تاب من بعدہٖ واصلح فانہ غفور رحیم ۔ (الانعام ۔ ۶۶)	جو شخص تم میں سے کوئی برا کام جہالت سے کر بیٹھے پھر وہ اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے پس وہ غفور رحیم ہیں ۔

توبہ کے بعد معصیت ترک نہ کرنا فریب نفس ہے ۔ ترک معصیت کے بعد پھر کسی وقت وہ معصیت سرزد ہو جائے تو یہ منافی توبہ نہیں ۔ پھر توبہ کر لی جائے ۔

قانون مغفرت ۔ مغفرت کے متعلق ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ایمان کے بعد غیر اسلامی زندگی گزار کر بھی وہ مستحق رحمت ہو جاتے ہیں یہ بالکل

غلط اور غیر قرآنی فکر ہے۔ جس طرح حصولِ رزق کا ایک نظام اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے جس کی اتباع کے بغیر انسان کو رزق عطا نہیں کیا جاتا۔ مثلاً زمین کی استواری، تخم ریزی، آبیاری وغیرہ کے بغیر انسان رزق (غلہ) نہیں حاصل کر سکتا اسی طرح حصولِ مغفرت کا بھی ایک الٰہی نظام ہے۔ جس پر کما حقہٗ عمل پیرا ہوئے بغیر انسان حق تعالیٰ کی مغفرت و رحمت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ خالقِ انسان نے اپنے اس ارشاد میں طلب مغفرت کے مقررہ نظام کو بیان فرما دیا ہے۔

انی لغفار لمن تاب و اٰمن و عمل صالحاً ثم اھتدیٰ (طٰہٰ ع ۴)	بیشک میں بڑا بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور شائستہ عمل کرتا ہے پھر اسی سیدھے راستہ پر قائم رہتا ہے

اس آیت سے حق تعالیٰ کے قانونِ مغفرت پر کافی روشنی پڑتی ہے قانونِ مغفرت کے یہی چار دفعات ہیں (۱) شرک و کفر و نفاق سے توبہ (۲) ایمان باللہ (۳) مقتضیاتِ ایمان کو پورا کرنا (شائستہ اعمال) (۴) اور بہرحال اس پر قائم رہنا۔ ان کو کما حقہٗ اختیار کئے بغیر کوئی شخص مستحق رحمت و مغفرت نہیں ہو سکتا۔ مغفرت کے اس مقررہ نظام پر عمل کرنے کے بعد اگر کوئی لغزش، غلطی، بُرا کام ہو جائے اور بندہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے تو حق تعالیٰ نے یقین دلایا ہے کہ وہ اپنے بندہ کیلئے قطعاً غفور ہیں۔

ان تکونوا صالحین فانہ کان للاوابین غفوراً (اسرا ع ۳)	اگر تم شائستہ اعمال کرتے ہو تو وہ (گناہ سے) توبہ کرنے والوں کی خطا معاف کرتا ہے۔

حق تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کے اس مقررہ نظام سے صرف نظر کر کے اور دنیا ہی کو مطلوب و مقصود بنا کر جو لوگ معصیتوں میں مبتلا ہیں وہ بڑے سخت شیطانی فریب میں ہیں۔ صالح ہونیکے بعد بھی بندہ کما حقہٗ خالق و مخلوق کا حق ادا نہیں کر سکتا، مرضی حق کے خلاف دانستہ یا نادانستہ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے اکثر اوقات بندہ کو اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہنا چاہیئے۔ دیگر قرآنی اشغال بندگی کے منجملہ یہ بھی ایک شغل بندگی ہے

جو شخص استغفار کو جو حضور قلب سے ہو اپنے پر لازم کر لیتا ہے۔ دین و دنیا کی برکتیں اس پر نازل فرمائی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری دی ہے اس شخص کو جس کے نامہ اعمال میں استغفار کثرت سے ہو۔

طوبیٰ لمن وجد فی صحیفته استغفاراً کثیراً۔ (ابن ماجہ)	خوشی ہے اس کے لئے جو اپنے اعمال نامہ میں بہت استغفار پاتا ہے۔

دین فطرت کے یہ وہ بنیادی افکار و اعمال ہیں جن کو قبول و اختیار کرنے کے بعد بندہ حسب مفہوم قرآنی بندۂ مومن ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی شائستہ (صالح) ہوتی جاتی ہے۔ تخیل میں بلندی و خوبی اور کردار میں حسن و پاکیزگی عطا کی جاتی ہے جس کا قرآنی نام حیات طیبہ ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ فلنحیینه حیوٰة طیبة (النحل ۱۳)	مرد عورت جو بھی شائستہ کام کریگا۔ ہم اس کو حیات طیبہ سے سرفراز فرمائینگے۔

اور ابدی بامراد زندگی حیات طیبہ کا یقینی بدل ہے۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت لهم جنٰت النعیم۔ (لقمان)	تحقیق کہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے ابدی بامراد زندگی ہے۔

قرآن میں صالحین کا دوسرا نام اصحاب الیمین ہے۔ دین کی تبلیغ و اشاعت کو اصحاب یمین کا فریضہ نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن مجید سے ثابت ہے کہ دین کی تبلیغ و اشاعت بھی اصحاب یمین صالحین کی صفت ہے۔

ثم کان من الذین اٰمنوا وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمة اولٰٓئك اصحٰب المیمنة (البلد پ ۳۰)	پھر ہوا ان لوگوں میں جو ایمان لائے اور ایک دوسرے کو نصیحت کرتے تھے صبر کے ساتھ اور نصیحت کرتے تھے مرحمت کے ساتھ یہی لوگ اصحاب یمین ہیں۔

ہر مومن کا فرض ہے کہ اپنی ذات کے علاوہ اپنے متعلقین کو بھی ان اعمال سے محفوظ

رکھنے کی کوشش کرے جن سے ابدی زندگی تباہ و برباد ہوتی ہے۔

یاایھا الذین امنوا قوا انفسکم و اھلیکم نارا (التحریم)	اے ایمان والو بچاؤ اپنی جان کو، و اپنے متعلقین کو دوزخ کی آگ سے۔

بندہ صالح بندہ مخلص ہوتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے بندہ کی جو منزل مقصود متعین فرما دی ہے وہی اس کی مراد ہوتی ہے یعنی حیاتِ آخرہ یہی اخلاص ہے بندۂ مخلص ہوئے بغیر بندۂ جاں نثار ہونے کی قابلیت نہیں پیدا کی جاتی۔ جاں نثاری شہادت کا مقام ہے صالحیت سے مافوق شہادت و صدیقیت کے مقامات ہیں جو دین ہی کے بلند و بلند ترین درجات ہیں ان درجات کا تعین بھی اللہ، رسول ہی کے ارشادات و آیات محکمات سے ہونا چاہیئے۔ آیاتِ محکمات ہی ام الکتاب ہیں۔

شہادت

شہادت کے معنی ہیں گواہی دینا۔ راہ حق میں جان عزیز کو قربان کر دینا مومن پر غور و فکر سے جب اپنی مربوبیت واضح اور جل شانہٗ کی ربوبیت مستحضر ہو جاتی ہے تو مومن تمام اشیاء کے آثار و خواص میں فیضانِ ربوبیت کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ تربیت کرنے والے کو رب کہتے ہیں۔ پرورش کرنا نشو و نما کرنا، شر و آفات سے محفوظ رکھنا۔ تحتِ حکمت حاجت روائی کرنا، راہ حق پر قائم رکھنا، منازل حیات کو طے کراتے ہوئے مقصد حیات کو پہنچانا۔ یہ سب امور تربیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ تمام موجودات ارضی و سماوی انسان کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اشیاء میں حرکت و تغیر۔ ان کے آثار و خواص انسان میں قوت و فعل، اشیاء کے مضر اثرات سے انسان کی بقاء حیات اور اس کی نشو و نما کا سامان کرنا نیز برائیوں سے محفوظ رکھنا اور نیک عمل کرنے کی توفیق عطا کرنا حق تعالیٰ ہی کی ربوبیت کا فیضان ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا یہی مطلب ہے۔ اس فیضانِ ربوبیت پہ جب نظر جم جاتی ہے تو اشیاء کے آثار و خواص اور اپنی تدابیر و اسباب کی مؤثریت

فنا ہوجاتی ہے اور ہر وقت حق تعالیٰ کی طرف توجہ رہتی ہے۔ ہر درد و تکلیف اور ہر مصیبت و پریشانی و ہر ضرورت و حاجت کو وہ رب ہی سے عرض کرتا ہے اور نفس و شیطان کے شر سے محفوظ رکھنے کی دعائیں کرتا رہتا ہے۔ اس کو یہ یقین ہوجاتا ہے کہ حق تعالیٰ کے پیش نظر میری صلاح و فلاح ہی ہے۔ اور وہ میرے لئے ہمہ خیر ہیں۔ رب کا بیدہ الخیر ہونا کا مشاہدہ ہوجاتا ہے جس کے بعد جان و مال کے ہر ضرر و تکلیف و مصیبت میں وہ خیر ہی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ بندہ کے لئے جو خیر حق تعالےٰ کے پیش نظر ہے وہ خیر آخرۃ ہے۔

واللہ یرید الاٰخرۃ (الانفال)	اللہ تعالیٰ کی مراد آخرت ہے۔

وہی خیر ابقیٰ و لازوال ہے۔ اس لحاظ سے آخرت کی وہ زندگی ابدی پر مسرت زندگی جس کا نام الجنۃ ہے اور توجہ ربوبیت سے محروم ہونے کی صورت میں وہ ابدی زندگی جس کا نام الجحیم ہے وہ بھی کا لمشاہدہ ہوجاتی ہے جس کے بعد اپنے افکار، گفتار و کردار سے وہ اس حقیقت کی گواہی دیتا رہتا ہے۔ اس لئے اس مقام کو شہادت اور اس مقام کے انسان کو شہید کہا جاتا ہے، چنانچہ سورۂ ق میں دوزخ اور جنت کے ذکر کے بعد ہی یہ ارشاد ہے

ان فی ذٰلك لذكریٰ لمن كان لهٗ قلبٌ	تحقیق اس میں نصیحت ہے اسکے لئے جو دل سے متوجہ یا
او القی السمع وھو شھید (سورہ ق)	ہمہ تن گوش ہے اور وہ گواہی دینے والا ہے۔

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ عالم آخرت کے جو حقائق بیان کئے گئے ہیں ان کو اس طرح سن رہا ہے کہ دیکھ رہا ہے۔ جب حیاتِ آخرہ کا لمشاہدہ ہوجاتی ہے تو اس ابدی پر مسرت زندگی (الجنۃ) اور اس کے درجات کے حصول کی ایک تڑپ اور ایک مطالبہ مومن کے دل میں پیدا ہوجاتا ہے اور اشاعت حق کے لئے تن من دھن کی بازی لگانے کا جذبہ ابھر آتا ہے اور یہیں سے مومن کی مجاہدانہ زندگی شروع ہوتی ہے۔ مومن کا دو طریقوں سے جہاد کرنا حدیث سے ثابت ہے۔

ان المؤمن یجاهد بسیفہ ولسانہ (مشکوٰۃ شریف کتاب الاداب باب البیان)	مومن جہاد کرتا ہے تلوار سے اور زبان سے ۔

جہاد بالسیف کو قرآن میں قتال فی سبیل اللہ فرمایا گیا ہے اور جہاد باللسان امر معروف و نہی منکر ہے ۔ جس کا مطلب علماً و عملاً اعلائے کلمۃ الحق ہے اور اسی لسانی جہاد کو قرآن شریف میں جہاد کبیر فرمایا گیا ہے ۔

وجاھدھم بہ جھاداً کبیرا (الفرقان)	اور جہاد کر ساتھ اس (قرآن) کے بڑا جہاد ۔

اس آیت کے تحت حدیث ذیل یا سلف کے قول کے معنی پر روشنی پڑتی ہے ۔

رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر ۔	پلٹے ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف ۔

ہر چند بزرگان دین نے جہاد اکبر سے جہاد نفس مراد لیا ہے ۔ لیکن جو طریقہ تعلیم ان سطور میں درج ہے اس کے لحاظ سے مرتبۂ صالحیت ہی میں مجاہدۂ نفس کا سلسلہ شروع ہوکر خواہشات نفس تابع شریعت ہو جاتے ہیں ۔ لہٰذا جہاد باللسان قولاً وعملاً اعلائے کلمۃ الحق کو جہاد اکبر قرار دینا صحیح ہے اعلائے کلمۃ الحق میں بھی نفس کا کافی مجاہدہ رہتا ہے ۔ لعن طعن اور مختلف قسم کی اذیتیں پہنچتی رہتی اور نفس کو پوری طرح قابو میں رکھنا پڑتا ہے ۔ اسی لئے بسلسلۂ اعلائے کلمۃ الحق تواصوا بالصبر کی تاکید ہے ۔ معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

من قتل فی سبیل اللہ فھو شھید ومن مات فی سبیل اللہ فھو شھید ۔	جو اللہ کی راہ میں قتل ہوا پس وہ شہید ہے اور جو اللہ کی راہ میں مرا وہ شہید ہے ۔

قتل ہونے کا تعلق جہاد بالسیف سے ہے اور فی سبیل اللہ مرنے کی صورت یہی ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، دین کی تبلیغ و اشاعت علماً و عملاً زندگی کا اوّلین فرض ہو اور اس سلسلہ میں زبان، جان و مال کو بطیب خاطر برداشت کرتے ہوئے اہل باطل کی اذیتوں اور سختیوں کو ہمت و استقلال کے ساتھ گوارا کرتے ہوئے جان، جاں آفریں کے سپرد کر دی جائے

عزیمت کا یہ مقام ان ہی اہل نظر کو حاصل ہوتا ہے جن کا ایمان خبر کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل میں داخل ہو جاتا ہے یعنی اخروی زندگی، وہاں کے مراتب و درجات کی خبر اور اللہ جل شانہٗ کا فیضانِ ربوبیت جو ہر شئی سے نمایاں ہے۔ اور حق تعالیٰ کا ہمہ خبیر ہونا کا لمشاہدہ ہو جاتا ہے وہ ہر زحمت میں رحمت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ راہ حق میں ہر ضرر و ہر اذیت کو برداشت کرتے ہوئے باطل کی گندگیوں سے اپنے آپ کو ہر قیمت بچائے رکھتے ہیں یہی عزیمت ہے۔

وان تصبروا وتتقوا فان ذٰلک من عزم الامور (آل عمران ۱۹۶)	اور اگر ثابت قدم رہو اور پرہیز کرو تو یہ عزیمت کے کام ہیں۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ انسان کا یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ نفع و ضرر کے تعلق سے انسان، ہر اس شخص کو جس سے وہ قرابت یا دوستی رکھتا ہے ضرر سے بچنے اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے مشورے و ہدایتیں دیتا رہتا ہے۔ اخروی زندگی کا ابدی نفع و ضرر اور وہاں کے مراتب و فضائل جب کا لمشاہدہ ہو جاتے ہیں تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک فطری عمل ہو جاتا ہے۔ اور دکھ و اذیت جو اس راہ میں پہنچتی رہتی ہے۔ وہ ایمان کی لذت و حلاوت میں اضافہ کرتی رہتی ہے، عزیمت دراصل حق تعالیٰ سے گرویدگی و شیفتگی پیدا ہو جانے کی ایک واضح علامت ہے۔ غلبۂ باطل کے زمانہ میں علماً و عملاً حقیقی معنوں میں بلا لحاظ لومۃ لائم و ضرر جان و مال اسلام کی نمایندگی کرنا۔ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرنے کے لئے جان و مال، عزت و آبرو کو قربان کر دینا، اہل عزیمت ہی کا کام ہے جو دراصل حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کی گواہی دینا ہے۔

شہد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو والملٰئکۃ واولوا العلم قائماً بالقسط (آل عمران ع)	گواہی دی ہے اللہ نے کہ بجز اس کے کوئی معبود نہیں اور ملائکہ نے اور اہل علم، توازن و اعتدال قائم رکھنے والوں نے۔

قائماً بالقسط سے وہی لوگ مراد ہیں حق و باطل کی آمیزش کے زمانہ میں جو حق ہی پر قائم رہتے ہیں اور تن، من، دھن کی بازی لگا کر اثبات حق کی گواہی دیتے ہیں۔ اور شہادت کا

درجہ و مقام حاصل کر لیتے ہیں ۔ جان و مال کی بازی لگا کر اثبات حق کی گواہی دینے کا عزم و حوصلہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ حیاتِ آخرہ کا مشاہدہ ہو جاتی ہے اور دنیا کے ہر زیان و ضرر میں آخرت کا نفع ہی نفع نظر آتا ہے ۔

صدیاں گذر گئیں کہ مقام شہادت کی یہ قرآنی و انبیائی تعلیم مستور ہو گئی خواص ہوں کہ عوام ، امیر ہوں کہ غریب مجاہدانہ زندگی سے عاری ہو گئے ۔ رخصت ہی کو بہانہ بنایا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں تعطل وجمود پیدا ہو گیا ۔ اور ہر کہ و مہ کے سر میں دنیا برائے دنیا کا غیر فطری و غیر قرآنی تخیل کار فرما ہو گیا ۔

سلوک مروجہ میں مقام شہادت کی جو تعلیم ہے اور جس کو توحید افعالی کہا جاتا ہے جہاں خلق و کسب کی پیچدار بحثیں انسان کو جبر و اختیار کے چکر میں مبتلا کر دیتی ہیں ۔ اس کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ اللہ جل شانہ' خالقِ افعال ہیں اور بندہ کاسب ۔ تخلیقِ فعل کے بعد بندہ سے افعال سرزد ہوتے ہیں ۔ بندہ تخلیق فعل میں مجبور ہے اور کسب میں مختار ۔ اس تعلیم سے مردہ قلوب میں نہ کوئی زندگی پیدا ہوتی ہے اور نہ کوئی مجاہدانہ تڑپ نہ حق گوئی کا حوصلہ و ہمت ۔ علاوہ ازیں اس تعلیم سے جبر کا ایک غلط تصور پیدا ہو جاتا ہے اور انسان کے صاحبِ اختیار ہونے پر کافی زد پڑتی ہے ۔ چنانچہ خلق و کسب ، جبر و اختیار کے مباحث سے کتابیں بھری پڑی ہیں ۔ پھر بھی ہر دور کے طالبانِ حق کے لئے یہ مسئلہ عقدہ' لاینحل ہے ۔ حالانکہ اللہ جل شانہ' کے خالق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان تخلیق فعل میں مجبور ہے ۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان تخلیق فعل میں بھی اللہ ہی کا محتاج ہے اور خالقِ انسان اپنے فضل و کرم سے انسان کی اس حاجت کو ہر آن پوری کر رہا ہے جس کی وجہ سے انسان اپنی زندگی کے کاروبار کو انجام دینے کے قابل بنا ہوا ہے ۔ حق تعالیٰ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں اس قابلیت کو سلب کر لیں مگر ایسا کرنا حق تعالیٰ کی شان عدل و عطا سے بعید ہے ۔ جب تک کوئی حکمت اس کی مقتضی نہ ہو اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے

بعد کہ انسان اپنے فاعل و مختار ہونے میں بھی اللہ جل شانہٗ کے فضل و رحمت کا محتاج ہے۔ اللہ جل شانہٗ سے گرویدگی و وابستگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور جبر کا کوئی تصور بھی پیدا نہیں ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیق فعل میں جبر کا تصور پیدا کر کے دین میں مشکل اور پیچیدگی پیدا کرنا ہے بغور دیکھا جائے تو تخلیق سے اختیار ثابت ہوتا ہے۔

سنن و آثار سے توحید افعالی کی مروجہ تعلیم بھی اور توحید و شرک کی مروجہ تقسیم یعنی توحید آثاری و توحید افعالی وغیرہ ثابت نہیں ہے۔ اصولی و اجتہادی غلطی سلوک مروجہ میں یہی ہے کہ توحید کے معنی رفع اثنینیت دوئی کو مٹانا قرار دیئے گئے۔ اس اصولی غلطی کی وجہ سے بعض فکری و نظری غلطیوں کا واقع ہونا ناگزیر تھا اور یہی لغزش بطور مسلمات کے صدیوں سے چلی آرہی ہے۔

شہادت سے مافوق صدیقیت (قرب یا احسان) کا درجہ ہے۔ مگر اس کو بیان کرنے سے قبل تصوف کے ان بنیادی عقاید کو واضح کر دینا ضروری ہے جو مخالف کتاب سنت ہیں۔

عرفان مروجہ پر ایک نظر

مروجہ عرفان کے بنیادی مسلمات کا ماخذ کتاب و سنت نہیں ہے بلکہ کشف ہے۔ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے تصوف کو فن کی حیثیت سے مدون فرمایا ہے۔ اور وہ عارفین کو اصحاب کشف فرماتے ہیں۔

قل العارفون اصحاب الکشوف۔	عارفین اہل کشف بہت کم ہیں۔

اور یہ بھی فرماتے ہیں۔

ھو الامر الذی کشفہٗ العارفون۔	وہ ایک بات ہے جو عارف پر کشف ہوئی ہے۔ (فصوص الحکم فص مہیمیہ فی کلمۃ ابراہیمیہ)

حضرت مجدد الف ثانی رح فرماتے ہیں۔

مردماں گمان دارند کہ علم اسرار عبارت از علوم توحید وجودی است و شہود وحدت در	لوگ خیال کرتے ہیں کہ اسرار کا علم عبارت ہے توحید وجودی کے علوم سے، اور وحدت کو کثرت میں اور

کثرت ومشاہدہ کثرت در وحدت کنایۃ است
ازمعارف احاطہ وسریان وجود وقرب و
معیتِ اوتعالیٰ بر نہجیکہ مکشوف ومشہود
ارباب احوال است، حاشاو کلا ثم حاشا
وکلا کہ ایں علوم ومعارف ازعلوم اسرار
بودن شایان مرتبۂ نبوت باشد الخ

(مکتوب ۲۶۸ دفتر اول)

کثرت کو وحدت میں مشاہدہ کرنا کنایہ ہے ان
معارف سے جو وجود حق تعالیٰ کے احاطہ وسریان
اورقرب ومعیت سے متعلق ہے جس طریقہ پر کہ
ارباب احوال کو مکشوف ومشہود ہے۔ ہرگز
ہرگز ان علوم ومعارف کا علم اسرار ہونا مرتبۂ
نبوت کے شایاں نہیں ہے۔

مجدد صاحب کی تحریر سے بھی عرفان مروجہ کا کشفی ہونا ثابت ہے اور یہ بھی واضح ہے کہ یہ انبیائی علوم نہیں۔ شاہ عبدالعزیز رح فرماتے ہیں۔

مسئلہ وحدت وجود درشرع صراحتہً
نیامدہ نہ درکتاب و نہ درحدیث حضراتِ
صوفیہ برائے تائید کشف وشہود خودکہ
مدار ایں مسئلہ بر ہماں است ازکتاب و
سنت اشارات برآوردہ اند۔

(فتاویٰ عزیزیہ جلد اول)

مسئلہ وحدت وجود شریعت میں صراحتہً نہیں
ہے نہ قرآن میں نہ حدیث میں حضراتِ صوفیہ
نے اپنے کشف وشہود کی تائید میں کہ اس مسئلہ
کا دارو مدار اسی پر ہے۔ کتاب وسنت سے
اشارات تلاش کرلئے ہیں۔

اکابر محققین کے ارشادات سے واضح ہے کہ سلوک مروجہ کے بنیادی مسلمات کا ماخذ کشف ہے نیز یہ بھی کہ کشف کی تائید میں کتاب وسنت سے اشارات تلاش کئے گئے ہیں۔ خواب کی طرح کشف بھی محتاج تعبیر ہوتا ہے۔ اور تعبیر میں غلطی کا بہت امکان ہے ایسی صورت میں کشف کی تائید آیاتِ محکمات سے ہونا چاہیئے نہ کہ اشارات سے۔ آیاتِ محکمات ہی ام الکتاب ہیں۔

هوالذی انزل علیك الکتاب منه

وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل کی بعض آیتیں

اٰیٰتٌ محکمٰتٌ ھنّ امّ الکتاب (آل عمران)　　اس کی محکم ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی۔

دین اور کمال دین کی تعلیمات کا تمام تر تعلق آیات محکمات سے ہے آیات متشابہات کی تعبیر اگر محکمات کے خلاف ہو تو ایسی تعبیر الحاد و زندقہ کا سرچشمہ ہوگی۔ آیات محکمات کے معیار پر جو کشف و الہام نہ ہو وہ قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ مخالفین حق، اہل فلسفہ کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قرآن مجید کو حجت بالغہ قرار دینے کے بجائے علم کلام ایجاد کیا گیا اور یہ سمجھا گیا کہ منطقی اور فلسفیانہ استدلال کو منطقی فلسفیانہ طریقہ ہی سے رد کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اہل باطل کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے قرآنی استدلال سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ قرآنی استدلال میں باطل کی سرکوبی کی جو قوت ہے اس کو بیان فرمایا گیا ہے۔

بل نقذف بالحق علی الباطل فیدمغہ فاذا ھو زاھق۔ (الانبیاء)	بلکہ ہم حق بات کو باطل پر پھینک مارتے ہیں سو وہ اس کا بھیجا نکال دیتا ہے پس وہ مغلوب ہوجاتا ہے۔

ایسے زبردست حربہ کو استعمال نہ کرکے علم کلام ایجاد کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ایمان جو ایک وجدانی و فطری کیفیت کا نام ہے وہ استدلالی ہو کر رہ گیا۔ استدلالی ایمان میں تمکین و یقین کی قوت پیدا نہیں ہوتی جیسا کہ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں۔

کارِ استدلالیاں چوبین بود	پائے چوبیں سخت بے تمکین بود
گر باستدلال کارِ دیں بدے	فخرِ رازی راز دارِ دیں بدے

یا زمانۂ حال کے مفکرین اسلام میں اقبالؒ کہتے ہیں۔

علاج ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا	غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

جو حضرات یہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے ایمان میں یقین کی قوت نہیں ہے انہوں نے یقین حاصل کرنے کے لئے کشف کی طرف توجہ کی ہے اور یہ سمجھا کہ جن امور غیبیہ پر ہمارا ایمان ہے۔ اگر وہ امور مکشوف ہوجائیں تو یقین کا سرچشمہ ہاتھ آجائے گا۔ اس طرح کشف کی جانب

طالبانِ حق مائل ہوئے۔ نیت یہی تھی کہ ایمان استدلالی کشفی ہو جائے۔ چنانچہ مجدد صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں۔

مقصود در طریقہ سلوک صوفیہ حصول ازدیاد یقین است بحقیقت معتقداتِ شرعیہ۔

طریقۂ صوفیہ کے سلوک سے مقصود یہ ہے کہ معتقداتِ شرعیہ کی حقیقت پر یقین زیادہ ہو جائے۔

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

شخصے از خواجہ نقشبند قدس سرہٗ سوال کرد مقصود از سلوک چیست۔ فرمودند تا معرفت اجمالی تفصیلی گردد و استدلال کشفی شود الخ

(مکتوب سی دفتر اول)

خواجہ نقشبند قدس سرہٗ سے کسی نے سوال کیا۔ کہ مقصود سلوک کیا ہے؟ فرمایا تا اجمالی معرفت تفصیلی اور استدلال کشفی ہو جائے۔

تعجب ہوتا ہے کہ کیوں یقین حاصل کرنے کے لئے قرآن مجید کو کافی نہیں سمجھا گیا حق سبحانہٗ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قد بینا الاٰیٰت لقوم یوقنون (بقرہ)

ہم نے صاف صاف دلیلیں بیان کر دی ہیں ان کے لئے جو یقین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

سورۂ رعد میں ارشاد ہے۔

یدبر الامر یفصل الاٰیٰت لعلکم بلقاء ربکم توقنون۔

وہی (اللہ) ہر امر کی تدبیر کرتا ہے اور دلائل کو صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم کو لقاء رب کا یقین ہو جائے۔

حقیقت ہے کہ قرآنی طریقۂ تفہیم سے بہتر اور کوئی طریقہ سہل اور آسان نہیں ہو سکتا۔

ولقد یسرنا القراٰن للذکر فھل من مدکر (القمر)

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ دین و کمال دین کے قرآنی علوم کی صداقت پر یقین حاصل ہونے کے لئے قرآنی طریقۂ تعلیم، قرآنی طریقۂ افہام و تفہیم ہی نہایت سہل و آسان ہے۔

صالحیت، شہادت و صدیقیت ایمان ویقین ہی کے مدارج ہیں۔ ان حضرات کی نیت نیک تھی وہ براہِ کشف یقین کی دولت سے مشرف ہوئے۔ مگر امور کشفی کو واقعات پر منطبق کرنے میں بھی غلطی کا امکان ہے یہ غلطی اگرچہ اجتہادی ہوگی۔ شریعت کے معتقدات جو آیاتِ محکمات سے متعین ہیں کشف کی صحت و عدم صحت کا وہی معیار رہیں۔ صدیقیت یا قرب واحسان کے علوم ومعارف اگر معتقداتِ شرعیہ کے مغائر ہوں تو صحیح عرفان نہیں ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بہ توفیقِ ایزدی کشف والہام کے مسلمات کی بنیادی غلطیوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں سلسلہ وار عرض کرتا ہوں۔

۱۔ انسانی زندگی کی بنیاد کلمۂ دعوتی "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے اس کلمہ کا مفہوم سلوک مروجہ میں بعض اکابر نے یہ بیان فرمایا ہے۔

"لا شیٔ من الالٰہ غیر اللہ وکل الٰہٍ عین اللہ فحصل التوحید بین الالٰھۃ الممکنۃ وبینہٗ سبحانہ وتعالیٰ بعبارۃ المحکم کما حققہٗ اکابر الصوفیہ۔	الٰہ میں سے کوئی غیر اللہ نہیں ہے اور ہر الٰہ عین اللہ ہے پس حاصل ہوئی توحید ممکنات اور حق تعالیٰ کے درمیان عبارت محکم سے جیسا کہ اکابر صوفیہ نے اس کی تحقیق کی ہے۔

پس اس سے لازم آیا کہ جو الٰہ ظاہر میں موجود ہے عین اللہ ہے۔"

اس سلسلہ میں کفار کی ذہنیت کے متعلق تحریر ہے کہ

"کفار الٰہ کثیر کو غیر اللہ کا جانتے تھے۔"

جس کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے۔

"اور جس امر سے کفار انکار شدید رکھتے تھے وہ امر دیگر ہے پس وہ امر دیگر کہ مناطِ شرک کا ہے زعم غیریت کا ہے اور فرق کرنا درمیان حق تعالیٰ اور درمیان اصنام اور تمامی اشیاء کے پس واسطے رد غیریت اور تفرقہ کے اُتارا اللہ تعالیٰ نے لا الٰہ الا اللہ اور دیگر آیاتِ توحید کو کہ مطابق اور مؤید کلمہ طیبہ کی ہیں ورنہ اثباتِ وحدت الوجود کی

حاجت نہ تھی اس لئے کہ واقع اور نفس الامر میں مغائرت اور تفرقہ کہاں۔"

(مقدمہ فصوص الحکم صـ ۲۲، ۲۶ مرتبہ شاہ مبارک علی)

دیگر حضرات صوفیا فرماتے ہیں۔

"انا لانری مع الحق من الخلق احداً (شیخ ابوالحسن) — ہم خدا کے ساتھ کسی مخلوق کو کچھ بھی نہیں دیکھتے۔"

"فرمودند کہ وقتیکہ من از پوست خود بیروں آمدم وعاشق ومعشوق وعشق رایکے دیدم۔ الخ — فرمایا کہ ایک وقت میں اپنی خودی سے باہر ہوا تو عاشق و معشوق وعشق کو ایک دیکھا۔" (گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ)

"با تو گویم سر اسرار نہاں ✤ اے برادر نقش رانقاش داں"

(ترجمہ) تجھ سے میں چھپے ہوئے بھیدوں کا بھید کہتا ہوں کہ اے بھائی ہر نقش کو نقاش سمجھ۔ مطلب یہ ہے کہ تو جس کو صورت سمجھ رہا ہے وہی صورت گر ہے۔

"ما ؤمن بگذار وبگذر از دوئی ✤ تا دریں راہ مرد صاحب سر شوی"

(ترجمہ) ہم اور میں سے نکل جا، دوئی سے گزر جا۔ تاکہ اس راہ میں تو راز سے واقف ہوجائے

"چوں تو یکتا باشی اے مرد خدا ✤ پس بقا باشد ترا بعد از فنا"

(ترجمہ) اے مرد خدا جب تو صرف ایک ہو جائیگا۔ پس بقا حاصل ہو جائے گی تجھے۔ فنا کے بعد

گویا سلوک الی اللہ کا کمال یہ ہے کہ وجود کی دوئی باقی نہ رہے صرف یکتائی رہے اس لئے کہ وجود مطلق ہی مقید بصورت ہے۔ اسی ادراک میں رہنا کمال ہے کہ دراصل حق ہی ظاہر اور حق ہی باطن ہے اور تعینات تمام اعتباری ہیں ؎

"تعینہا امور اعتباریست"

حضرت نجم الدین محمود ایک بزرگ کا ارشاد ہے۔

"جناب حضرتِ حق را دوئی نیست ✤ درآں حضرت درما وتوئی نیست"

(ترجمہ) حضرتِ حق کے حضور میں دوئی نہیں ہے۔ حضورِ حق میں ما و تو کا گذر نہیں ہے

ان غلطی ہائے مضامین کی وجہ یہ ہے کہ کشف کی راہ سے یہی پتہ چلا کہ حق تعالیٰ اپنے معلومات

کی صورت میں موجود و ظاہر ہیں۔ موجود و محسوس حق تعالیٰ ہیں۔ اور مخلوق صرف وہم و تعقل ہی ہے

الحق مشهود في خلق متوهم فالخلق معقول والحق محسوس مشهود عند المؤمنين واهل الكشف۔

خلق موہوم میں حق مشہود ہے پس خلق معقول ہے اور حق تعالیٰ محسوس و مشہود مؤمنین و اہل کشف کے نزدیک

(عبارت فصوص الحکم منقول از اسرار حق)

مطلب یہ ہے کہ مخلوقات جو حق تعالیٰ کی معلومات ہیں۔ حق تعالیٰ کے مرتبہ خیال میں ہیں وہ موجود نہیں ہوئے ہیں بلکہ حق تعالیٰ ہی اپنے معلومات کی صورت میں حسب قابلیت صورتِ معلومہ مرتبۂ خلق میں موجود ہیں۔ بلا لحاظ صورت مطلق ہیں۔ اور بلحاظ صورت مقید اسلیئے حق تعالیٰ ہی محسوس و مشہود ہیں خلق محسوس و مشہود نہیں ہے۔ یہی وہ کشف ہے جو مسئلہ وحدت الوجود کا بنیادی پتھر ہے اور عرفان مروجہ کی پوری عمارت اسی پر کھڑی ہوئی ہے۔ اسی کو جاننا و ماننا قرب و صدیقیت ہے۔ اسی کو سرِ تخلیق ، سر معیت اور تجلیٔ حق کہتے ہیں۔ اسی بناء پر توحید کا مفہوم "رفع اثنینیت" دوئی کو مٹانا قرار پایا یعنی بلحاظ وجود و صفات خالق و مخلوق کو ایک سمجھنا اور کلمہ طیبہ کا مطلب بھی یہ لیا گیا۔" اللہ ہی ہے کوئی غیر اللہ نہیں اور کفار کی ذہنیت کے متعلق بھی یہ تصفیہ کیا گیا کہ کفار الٰہ کثیر کا غیر اللہ کا جانتے تھے ، اور مناط شرک زعم غیریت کا ہے اور فرق کرنا درمیان حق تعالیٰ اور درمیان اصنام و تمامی اشیاء کے" اور اسی بناء پر کلمہ طیبہ کے نزول کا مقصد بھی یہ بیان کر دیا گیا " پس واسطے رد غیریت اور تفرقہ کے اُتارا اللہ تعالیٰ نے "لا الٰہ الا اللہ" گویا حق و باطل میں یہ نزاع برپا تھی کہ مخلوق غیر اللہ ہے یا عین اللہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملّا ٭ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

قرآن مجید سے اہل باطل کی ذہنیت کا پتہ لگایا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے اہل باطل اس وہم و گمان کو حقیقت سمجھے ہوئے تھے کہ اللہ جل شانہٗ کی ملک و حکومت ، فرماں روائی میں بعض مقبول بندگانِ خدا بھی شریک ہیں۔ تنہا ایک اللہ حکومت نہیں کر سکتا۔ یہ آیت کریمہ اسی ذہنیت کا پتہ دیتی ہے۔

لم یکن لہٗ شریک فی الملک ولم یکن لہ ولی من الذل وکبرہ تکبیرا (بنی اسرائیل)	اور نہ کوئی اس کی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اسکا کوئی مددگار۔ لہذا اس کی خوب بڑائی بیان کرو

اور بعض اس وہم وگمان میں مبتلا تھے کہ نظام کائنات ایک خالق علیم وحکیم کے حکم وقدرت سے بندھا ہوا مربوط وحکیمانہ نظام نہیں اور نہ اس کا ابدی انجام ہے۔

وقالوا ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا وما یھلکنا الا الدھر (الجاثیہ)	اور کہتے ہیں کہ بجز ہماری دنیوی حیات کے اور کوئی حیات نہیں ہے، ہم مرتے ہیں جیتے ہیں اور ہم کو (گردش) زمانہ سے موت آتی ہے۔

ان باطل تصورات کو حقیقت سمجھ کر وہ اللہ جل شانہٗ کو الٰہ واحد تسلیم نہیں کرتے تھے اور من مانی زندگی بسر کرتے تھے کلمۂ طیبہ کے ذریعہ اس طلسم کو توڑا گیا اور اس حقیقت کو ظاہر فرماکر ان کو بندگیٔ حق کی دعوت دی گئی کہ انسان کی حیات وممات، سعی و جدوجہد کا یہ نظام کائنات اللہ جل شانہٗ کی توجہ وارادہ وحکم سے جاری ونافذ ہے ان کے حکم وقدرت میں کوئی فرد خلق شریک وسہیم نہیں ہے۔ اور یہ کہ جزائے اعمال کا ایک ابدی نظام حیات اس دنیا کا آخری انجام ہے جہاں تمام انسان اپنے اچھے، برے اعمال کے حقیقی نتائج وثمرات پائیں گے، انسان کی فلاح اسی میں ہے کہ بندۂ حق بنا رہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام نے افراد خلق کو اللہ جل شانہٗ کا غیر نہ سمجھنے اور عین اللہ سمجھنے کی دعوت نہیں دی کیونکہ اوّل تو حق وباطل میں یہ نزاع نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ خود اللہ جل شانہٗ مخلوق کو غیر اللہ فرماتے ہیں۔

اہل باطل، اللہ کے سوا بعض افراد خلق کو بھی معبود سمجھتے تھے۔

واتخذوا من دونہ الھۃ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون (الفرقان)	خدا کے سوا ایسے معبود قرار دیتے ہو جو کسی چیز کے خالق نہیں خود مخلوق ہیں۔

ان افراد خلق کو اللہ جل شانہٗ نے غیر اللہ فرمایا ہے۔

ام لھم الٰہ غیر اللّٰہ سبحٰن اللّٰہ عما یشرکون	کیا غیر اللہ ان کا الٰہ ہے اللہ پاک ہیں ان کے شرک سے

جن افرادِ خلق کو وہ الٰہ سمجھتے تھے ان ہی سے ڈرتے بھی تھے۔ ان کے اس ڈرنے کو حق تعالیٰ غیر اللہ کا ڈر فرماتے ہیں۔

افغیر اللّٰہ تتقون (النحل)	کیا پھر بھی اللہ کے غیر سے ڈرتے ہو۔

غرض قرآن مجید میں مخلوق کو متعدد مقامات پہ خالق کا غیر فرمایا گیا۔ دانش حق یہی ہے کہ مخلوق غیر حق ہے۔ مخلوق کی غیریت کو محض کفار کی دانش قرار دے کر اس دانش کو مناطِ شرک سمجھنا اور یہ کہنا کہ خالق و مخلوق کی غیریت کو مٹانے کے لئے کلمہ طیبہ نازل فرمایا گیا درست نہیں اور بالکلیہ قرآن کے مخالف ہے ایسے تمام خیالات کشف کی غیر قرآنی تعبیر کے گمراہ کن نتائج ہیں۔

مخلوق و خالق کی غیریت و عینیت کی بے نتیجہ بحثوں کو اٹھا کر قرآنی تعلیمات میں پیچیدگی و الجھاؤ پیدا کر دیا گیا اللہ معاف کرے اکابر ملت نے آنے والی نسلوں کو اس بھنور سے نکلنا مشکل کر دیا ہے۔

غیریت ۔ غیریت کے لغوی معنی ہیں جدائی و دوئی۔ مخلوق، خدا سے غیر ہونے کا مطلب ان معنی کے لحاظ سے یہ نہیں ہے کہ موجوداتِ عالم خود بخود موجود ہیں اور اپنی ہستی و بقاء اور تغیرات و افعال و آثار میں اللہ جل شانہٗ کے اذن و حکم کے تابع نہیں ہیں۔ غیریت کے یہ معنی الحاد و زندقہ ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مخلوق موجوداتِ عالم اپنی ہستی و فنا و تغیرات وغیرہ میں بالکلیہ اذن و ارادۂ الٰہی کے محتاج ہیں اور ہر آن یہ احتیاجی نسبت قائم ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ کا اسم مبارک القیوم اس پہ دلیل ہے۔ غیریت کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ مخلوق اور اللہ بلحاظ وجود ایک نہیں، مخلوق کے صفات اللہ کے صفات نہیں۔ یعنی مخلوق میں حیات، سماعت بصارت، قدرت وغیرہ جو صفات پائی جاتی ہیں۔ یہ اللہ جل شانہٗ کے صفات "اسمائے حسنیٰ" نہیں ہیں۔ مخلوق اپنی ذات و صفات کے لحاظ سے قطعاً اللہ کی غیر ہے۔

اللہ لا الٰہ الا ھو لہ الاسماء الحسنیٰ (طٰہٰ ع ۱)	اللہ۔ کوئی معبود نہیں سوا اس کے اسمائے حسنیٰ اسی کے لئے ہیں (وہی ان سے متصف ہے)

بطور حصر حق سبحانہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ اسمائے حسنیٰ سے صرف اللہ ہی متصف ہیں۔ مخلوق میں جو صفات حیات سمع و بصر ہیں ان کو بھی حق تعالیٰ مخلوق فرما رہے ہیں۔

جعل لکم السمع والابصار الخ (النحل)	تمہارے لئے سماعت و بصارت بنائی۔
الذی خلق الموت والحیٰوۃ الخ (الملک)	جس نے موت و حیات کو پیدا کیا۔

مخلوق کے صفات بھی جب بروئے قرآن مخلوق ہیں تو ان کو خالق کے صفات ثابت کرنا اور اس لحاظ سے خالق کو مخلوق کا عین سمجھنا وجود و صفات کے لحاظ سے خالق و مخلوق کو ایک قرار دینا صحیح نہیں ہے قرآنی حقیقت کا انکار ہے۔

افمن یخلق کمن لا یخلق افلا تذکرون ہ (النحل ع ۲)	کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس جیسا ہے جو پیدا نہیں کرتا پھر کیا تم اتنا نہیں سمجھتے۔

آیۂ کریمہ کا یہی مطلب ہے کہ خالق و مخلوق ایک جیسے نہیں، نہ بلحاظ وجود اور نہ بلحاظ صفات جو صفت مخلوق کی ہے وہ خالق کی صفت نہیں ہوسکتی۔ مخلوق کی صفات، حیات، سماعت و بصارت وغیرہ بھی مخلوق، اس کو خالق کی صفات نہیں قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ تخلیق عالم کی علت یہ بیان کی جاتی ہے۔

لما شاء الحق سبحانہ من حیث اسمائہ الحسنیٰ التی لا یبلغھا الاحصاء ان یریٰ اعیانھا وان شئت قلت ان یریٰ عینہ فی کون جامع (الخ) (فصوص الحکم)	جب چاہا حق سبحانہ و تعالیٰ نے باعتبار اپنے اسماء حسنیٰ کے جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا کہ دیکھے حق تعالیٰ حقائق ان اسمائے حسنیٰ کے اور تو چاہے تو کہے کہ دیکھے حق تعالیٰ اپنے کو ایک موجود کی صورت میں۔

کہا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے اسماء حسنیٰ کو یا اپنی ذات کو خلق کی صورت میں

دیکھنا چاہا۔ اس خیال کی تائید میں یہ ایک حدیث بھی روایت کی جاتی ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا

کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق	میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں بس میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔

یہ حدیث کتبِ صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ اکثر علماء نے لکھا ہے کہ کتب احادیث صحیحہ میں اس حدیث کا پتہ نہیں چلتا۔

وہ حدیث جس کی سند ضعیف ہو مگر قرآنی منشاء و مفہوم اور دعوتِ قرآنی کے مطابق ہو تو قبول کی جا سکتی ہے۔ لیکن کسی حدیث کو محض اس وجہ سے قبول کر لینا جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بزرگ کے کشف والہام کے مطابق ہے خواہ وہ قرآنی مفہوم و دعوت سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ قرآن فہمی کا یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے کائنات اور انسان کی تخلیق کو انسان پر اپنا فضل و رحمت بیان فرمایا ہے۔ متعدد مقامات پر یہ ارشاد ہے۔

ان اللہ لذو فضل علی الناس ولکن اکثر الناس لا یشکرون ٥ (المؤمن)	بے شک اللہ تعالیٰ کا انسانوں پر بڑا ہی فضل ہے لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔

اکثر مقامات پر اپنے انعام و احسان کا ذکر کر کے یہی فرمایا گیا۔

لعلکم تشکرون ۔	تا کہ تم شکر گزار رہو۔

انسان کے قلب میں کسی کی شکر گزاری کا حقیقی جذبہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے کہ اُس پر احسان اور اس کی حاجت روائی میں احسان کرنے والے، حاجت روا کی کوئی غرض شامل نہ ہو کشف کی بنیاد پر یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ اپنا اور اپنے اسمائے حسنیٰ کا ظہور چاہتے تھے اسی لئے انسان اور مخلوقات کو پیدا کیا اور اس کی تائید میں یہ حدیث "کہ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں اسی لئے خلق کو پیدا کیا" تو اس سے حق سبحانہٗ تعالیٰ کے فضل و احسان کی قدر و منزلت باقی نہیں رہتی اور شکر کا جذبہ مضمحل ہو جاتا ہے۔ بلکہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کا اپنے انعام و احسان کو بار بار بیان فرما کر اپنی شان جود و عطا کو ظاہر کرنا

بھی عبث ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اپنے کمالات کے ظہور کے لئے مجھ کو پیدا کر کے مجھ ہی پر احسان دھرنا کیا معنی؟ ایسے حقائق بیان کرنا واقعہ یہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی شانِ عظمت و کبریائی کو گھٹانا ہے، رب اعلیٰ و عظیم ایسے تصورات سے بلند و منزہ ہے۔

سبحٰنہٗ وتعالیٰ عما یقولون علواً کبیراً | یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک و بہت بلند تر ہے

قرآنی منشاء و مفہوم اور قرآنی دعوت کے خلاف اگر کوئی حقیقت بیان کی جائے تو نہ وہ حقیقت ہے اور نہ عرفان۔ تمام قرآن مجید شروع سے آخر تک پڑھ جائیے۔ انسان پر حق تعالیٰ اپنا انعام و فضل و احسان کا اظہار کر رہے ہیں۔ انسان کا فقر و احتیاج اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کی غنیٰ و صمدیت کے باوجود انسان کی حاجت روائی قرآنی دعوت اعبدو اللہ کی یہی اصل ہے۔ انسان صرف حق تعالیٰ کا محتاج ہے۔ فقیر ہے۔ صرف اسی در کا بھکاری۔ غنیٰ و صمدیت کے باوجود محض فضل و رحمت سے انسان کی حاجت روائی کی جا رہی ہے۔ ہستی کا جامہ پہنایا۔ سمع و بصر و فواد کی قوتیں عطا فرمائیں۔ تدبیر امر اور کائنات پہ تصرف کرنے کی قابلیت بخشی۔ اشیاء کے صحیح استعمال کی رہبری فرمائی، فطری جذبات کی تربیت اور فطری مطالبات جن کا تعلق عارضی و ابدی زندگی سے ہے۔ ان کی تکمیل کے لئے علم و ہدایت کی روشنی عطا کی۔ ہر آن ہر حاجت پوری کر رہے ہیں۔ جب چاہیں فضل و رحمت سے محروم کر دیں جب چاہیں انعام و احسان کا سلسلہ بند کر دیں۔ یہی وہ حقائق ہیں جو انسان کی زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں ان ہی حقائق کی طرف انسان کو توجہ دلا کر "اعبدو اللہ" کی دعوت دی گئی ہے۔ اس ایک ہی بلیغ جملہ میں انسان کی تمام حاجات کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے۔

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (ابراہیم)	اور جو چیز تم نے مانگی تم کو ہر وہ چیز (تحت حکمت) دی گئی (تم پر جو انعامات کی بارش ہے تم اس پر غور کرو) تم اللہ کی نعمتوں کو شمار میں نہیں لا سکتے۔

کتنے لطیف اور دل نشیں انداز میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کائنات کا

ذرہ ذرہ اپنی ہستی و بقا میں خیر و خوبی، صلاح و فلاح میں صرف حق تعالیٰ کا بھکاری ہے اور حق تعالیٰ بشان جود و عطا ہر آن حاجت روائی فرما رہے ہیں۔

یسئلہٗ من فی السمٰوٰت والارض ط کل یوم ھو فی شان ۵	آسمان اور زمین میں جو بھی ہیں وہ اللہ سے مانگتے ہی رہتے ہیں وہ ہر وقت شانِ عطا میں ہے۔

ان آیاتِ بیّنات سے انسان پر اللہ جل شانہٗ کا جو فضل ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی روشنی میں اس باطنی حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ مخلوقات جن کے حقائق معلوماتِ حق ہیں وہ اپنے ظہور میں توجہ و ارادۂ الٰہی کے محتاج تھے اور ہستی و بقاء کے طالب تھے اور عرفانِ حق کے طلبگار۔ تاکہ عبادتِ حق کا شرف حاصل کریں۔ جو ایک محتاج و سائل اور عاجز کی اصلی خواہش ہے۔ اس خواہش کو **طلب یا اقتضاء** کہتے ہیں۔ اللہ خلاق و علیم نے اپنی رحمت سے تحت حکمت وقدرت، بشان عدل و احسان اِس طلب و حاجت کو پورا فرمایا۔ اپنے معلومات کو مخلوق و موجود، نیست سے ہست کیا؛ اور ہستی کے تمام صفات عطا کئے تاکہ وہ شرف عبادات حاصل کریں۔ مخلوقات کا وجود و صفات، حیات، سماعت، بصارت، قدرت و ارادہ، وغیرہ۔ اسمائے الٰہی کا فیض و اثر ہے نہ کہ حق تعالیٰ کے اصلی اسما و صفات۔ حدیث "کنت کنزاً مخفیاً" اگر صحیح ہے تو اس کا یہی مطلب درست ہو سکتا ہے کہ معلومات حق، عرفان و عبادت حق کے طالب تھے۔ اس لئے ان کو مخلوق کیا گیا۔ اب قرآنی حقائق سے تعارض بھی نہیں ہوتا۔ اور انسان پر اللہ جل شانہٗ کا فضل و احسان بھی ثابت ہوتا ہے۔ جس سے قرآن پاک بھرا پڑا ہے۔ یہ کہنا کہ "حق تعالیٰ اور اسماء حسنیٰ اپنا ظہور چاہتے تھے۔ اس لئے خلق کو پیدا کیا گیا"۔ قرآنی حقیقت نہیں ہے۔ کشف و الہام کی غلط تعبیر ہے۔ قرآن مجید سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ تخلیق عالم کی علت معلوماتِ حق کا تقاضائے ظہور ہے نہ کہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ کا تقاضا۔

۳۔ سرِ تخلیق کے سلسلہ میں بیان کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ نے تین مراتب داخلی اور تین مراتب

خارجی میں خود ہی نزول فرمایا۔ مراتب داخلی (۱) احدیت یہ مرتبہ ذات جو ساقط الاشارات اور غیب الغیب ہے۔ (۲) وحدت علم کا مرتبہ ہے (۳) واحدیت یہ مرتبہ ثانی وحدت کی تفصیل ہے۔ جہاں اسمائے الٰہیہ اور اسمائے کونیہ کی تفصیلات ہیں۔ مراتب خارجی۔ (۱) روح (۲) مثال (۳) اجسام۔ بروئے قرآن حق تعالیٰ کا ان مراتب ستہ میں خود ہی نزول فرمانا غلط ہے۔ کیونکہ قرآن مجید سے حق تعالیٰ کا نزول خلق کی صورتوں میں ثابت نہیں ہے۔ بلکہ علم و امر اور ملائکہ و روح کا نزول ثابت ہے۔

واعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو فھل انتم مسلمون (سورہ ہود)	جان لو کہ یہ (قرآن) اللہ کے علم سے نازل ہوا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس کیا تم مسلمان ہوتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ (الطلاق ع ۲)	(زمین و آسمان میں) اللہ کے احکام نازل ہوتے ہیں کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر شی پر قادر ہے۔

سورہ النحل میں ہے۔

ینزل الملٰئکۃ بالروح من امرہٖ ط	فرشتوں کو وحی دیکر اپنے حکم سے نازل کرتے ہیں۔

ان آیات سے کائنات کا بقاء و قیام اللہ جل شانہٗ کی قدرت و امر و علم سے مصرح ہے نہ کہ خود حق تعالیٰ کا نزول۔

۴۔ تخلیق کی حقیقت جو تجلی و تمثل بیان کی جاتی ہے وہ بھی قرآن مجید سے قطعاً ثابت نہیں ہوتی قرآن میں جہاں جہاں بھی معلومات کو مخلوق، موجود کرنے کا بیان ہے وہاں خلق یا جعل کا لفظ آیا ہے۔ تجلی و تمثل کا لفظ نہیں آیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ تجلی و تمثل کے معنی خلق کے نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے مطالبہ "رب ارنی" پر حق تعالیٰ نے اپنی شان "لن ترانی" بیان فرمائی وہاں تجلی کا لفظ استعمال کیا۔ جو تجلی "لن ترانی" ثابت کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اسی سے حق تعالیٰ کا مشہود و محسوس ہونا ثابت کیا جاتا ہے۔

کتاب وسنت اس تجلّی کی حقیقت کے بیان سے ساکت ہیں۔ البتہ اس کا اثر ظاہر ہے
کہ حضرت موسیٰ بیہوش ہو گئے۔ اور پہاڑ جل کر خاکستر ہو گیا۔ تجلّی سے کوئی غیر مخلوق چیز مخلوق
نہیں ہوئی۔ اس تجلّی سے پہلے حضرت موسیٰ بھی مخلوق تھے اور پہاڑ بھی۔ تو پھر تخلیق کو تجلّی کہنا
کس قدر غلط ہے۔ تجلّی کے یہ معنی کہ حق تعالیٰ ہی مخلوق کی صورت میں ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں ہے
سورۂ واللّیل میں دن کے لئے بھی لفظِ تجلّی استعمال فرمایا گیا ہے۔

والنّہار اذا تجلّیٰ | قسم ہے دن کی جب کہ وہ روشن ہو۔

یہاں تجلّی کے معنی روشن ہونے کے ہیں نہ کہ تمثّل، لغت واصطلاح زبانِ عرب میں بھی تجلّی و
تخلیق کے ایک معنیٰ نہیں ہیں۔ لہٰذا تخلیق کی یہ حقیقت کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ ہی بصورت مخلوق
ظاہر وموجود ہیں اور اس کو تجلّی قرار دینا انبیائی بصیرت نہیں ہے۔ لفظِ تجلّی حضراتِ صوفیہ
کی روزمرہ میں جس طرح اور جن معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ سنن و آثار سے اس طرح
اس لفظ کا استعمال ثابت نہیں ہے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں نہ حضرات
صحابہ کرام کی گفتگو میں۔

۵۔ سورۂ انعام میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لاتدرکہ الابصار ٥ | کوئی آنکھ اس کو نہیں پا سکتی۔

پھر حضراتِ صوفیہ کا یہ فرمانا کہ "الحق محسوسٌ ومشھودٌ" کس طرح صحیح ہوگا۔ انسان
کی نشو ونما پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ احساس میں سب سے پہلے بصر ہی کام کرتی ہے۔ بچّہ کو
ابتداءً آنکھ ہی سے اشیاء کے ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔ اس کے بعد تدریجاً دیگر حواس کام
کرتے ہیں۔ جب ابتدائی آلۂ حس، بصر کے متعلق یہ فرما دیا گیا کہ اس سے وجودِ حق محسوس نہیں
ہو سکتا تو دیگر آلۂ حس سے بھی وجودِ حق کا ادراک نہ ہونا لازم آتا ہے۔ نیز لفظ "الابصار"
صرف چشمِ سر ہی کے لئے قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ چشمِ دل کے معنی میں بھی
استعمال کیا گیا ہے جیسے :۔

فاعتبروا یا اولی الابصار	عبرت حاصل کرو اے عقل مندو!

اس آیت میں "اولی الابصار" سے اہلِ بصیرت، دل کی آنکھ رکھنے والے مراد ہیں۔ سورہ "ص" میں حضرات انبیاء علیہم السلام کا وصف بیان فرمایا گیا ہے۔

اولی الایدی والابصار	ہاتھوں والے اور آنکھوں والے۔

اگر اس آیت میں ایدی کے معنی یہ دو ہاتھ اور ابصار کے معنی دو آنکھیں مراد لی جائیں تو آیت کے کوئی معنی ہی نہ ہونگے۔ کیونکہ ہر انسان کے دو ہاتھ اور دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ پھر خصوصیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے یہ اوصاف بیان کرنا بے معنی بات ہوگی۔ لہٰذا اولی الایدی والابصار کا مطلب یہی ہے کہ صاحب اقتدار و قوت اور صاحبِ عقل و بصیرت، جب کلام الٰہی میں ابصار کا لفظ بصر و بصیرت، دونوں کے لئے استعمال ہوا ہے، لغت میں بصر کے معنی بصیرت کے بھی ہیں۔ تو آیۂ کریمہ لاتدرکہ الابصار کے صاف و صریح لغت و محاورہ قرآنی کے مطابق یہ معنی لینا کہ اللہ کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں بالکل صحیح ہے اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہیکہ بصیرت کی راہ سے بھی کسی کو نہ اللہ کی یافت ہے اور نہ اللہ کا شہود ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ ادراک وجودِ حق سے بصر و بصیرت دونوں عاجز ہیں۔ قرآن مجید کی دعوت "الی الحق" کا تمام تر مدار ایمان بالغیب پر ہے۔ ایمان بالغیب ہی دعوتِ حق کی روح ہے۔ متقیوں کا پہلا وصف ایمان بالغیب ہی بیان فرمایا گیا ہے۔

ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب (ہدایت ان ہی کے لئے ہے جو ایمان بغیب رکھتے ہیں)

ہدایت کیا، مرتبۂ صالحیت ہو کیا مرتبۂ شہادت و صدیقیت ہر مقام کے لئے ایمان بالغیب ہی ہے۔ سنن و آثار میں ایمان بالشہود کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ حضراتِ صحابہ کرام سے ایمان بالغیب ہی ثابت ہے۔ ایمان بالشہود کا کوئی تذکرہ یا ادعا جیسا کہ عرفان مروجہ کے عارفوں میں نظر آتا ہے حضراتِ صحابہ کرام کی زندگیوں میں اس کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ایمان کالمشاہدہ کتاب و سنت سے ثابت و مصرح ہے نہ کہ ایمان بالمشاہدہ۔ کمال ایمان، ایمان کالمشاہدہ ہے

۶۔ مذکورۂ افکار کی بنیاد پر سورہ احزاب کی آیتِ امانت

اناعرضنا الامانة علی السموٰت والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقن منها وحملها الانسان (ع۹)	اور ہم نے امانت آسمان و زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی سوانہوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لیا۔

کی یہ تعبیر صحیح نہیں ہے کہ انسان میں وجود، حیات، علم وقدرت، سماعت وبصارت، کلام وغیرہ کی جو صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ حق تعالیٰ کا اصلی وجود اور ان کے اصلی صفات ہیں اور انسان کے پاس وہی امانت ہے۔ کیونکہ وجود و صفات کم و بیش تمام مخلوق ارضی و سماوی میں پائی جاتی ہیں اور آیتِ امانت سے ظاہر ہے کہ امانت کا حامل صرف انسان ہے اور دیگر مخلوق نے اس کو لینے سے انکار کر دیا ہے۔ امانت وہی ہے جو صرف انسان میں پائی جائے اور دیگر مخلوق میں نہ ہو جو چیز دیگر مخلوق اور انسان میں مشترک ہو اس کو امانت کہنا درست نہیں ہے اگر حقیقت یہی ہے کہ عالم ہی حسب قابلیت معلوم ظاہر ہے تو پھر یہ کہنا کہ معلوم نے صفاتِ وجودیۂ حق کو امانتاً قبول کیا صرف ایک لفظی گورکھ دھندا یا منطقی داؤ پیچ ہے کیونکہ آیتِ امانت کی اس تعبیر سے سرِ تخلیق کی صحت باقی نہیں رہتی اور سرِ تخلیق کو صحیح مانا جائے تو آیتِ امانت بے معنی ہو جاتی ہے۔ آیتِ امانت ایک محکم آیت ہے جو اپنے معنی کے لحاظ سے سرِ تخلیق کو غلط ثابت کرتی ہے۔

۷۔ جب سرِ تخلیق یہ ہے کہ عالم ہی بصورت معلوم ظاہر ہے۔ یعنی عالم ہی معلوم کی صورت میں صفاتِ وجودیہ سے موصوف ہے۔ تو ایسی صورت میں حقیقتاً عبدیت کے تمام لوازم کا ادا کرنے والا عالم ہی ہے یعنی ربّ ہی عبد کی صورت میں عبادت کے تمام فریضے انجام دے رہا ہے۔ غور کیا جائے کہ یہ کس قدر سوءِ ادبی اور فساد عقیدہ کی بات ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ دین اور احکام دین کھیل تماشا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ حضراتِ انبیا علیہم السلام اور قرآن کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

۸ ۔ وجود و صفات ، حیات و علم و قدرت و سماعت و بصر و کلام و افعال جس طرح اللہ کے لئے ضروری ہیں اسی طرح بندہ کے لئے بھی ضروری ہیں۔ بغیر صفات و افعال کے بندہ بھی اپنے فرائض نہیں ادا کر سکتا تو ان کو لوازم الوہیت قرار دینا اور اللہ کے لئے مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے ان کو لوازم الوہیت قرار دے کر بندہ کے لئے بطور امانت تسلیم کرنا اور اس کو الوہیت معقیدہ کہنا محض کشف کی بات ہے ۔ لا الہ الا اللہ سے الوہیت صرف اللہ ہی کے لئے ثابت ہے

۹ ۔ امانت کا جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے اس سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ معہ صفات عبد کے استعمال میں ہے ۔ جو بڑی گستاخی و بے ادبی ہے ۔ اس سے تقدیس تنزیہ حق باقی نہیں رہ سکتی اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے ۔ کہ امانت کا استعمال وکالتاً رب ہی کر رہا ہے ۔ تو پھر عبدیت ایک ذہنی و خیالی چیز رہ جاتی ہے ۔

۱۰ ۔ کشف کو صحیح سمجھ کر اس کے مطابق آیتِ امانت کی تفسیر کرنا اور اپنی اور تمام مخلوقات کی صورتیں حق تعالیٰ کو موجود و ظاہر سمجھنا اور اسی کو قرب و صدیقیت قرار دینا بے دلیل بات ہے ۔ اگر یہی حقیقت ہوتی اور اسی کو جاننا اور ماننا قرب و صدیقیت ہوتا تو یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ضرور مروی ہوتی ۔ کیونکہ آپ ہی معلم کتاب و حکمت ہیں اور مقام صدیقیت کے علم و عمل کا تعین کشف سے نہیں بلکہ صرف خدا و رسول کے ارشاد سے ہونا قرآن مجید سے ظاہر ہے ۔

والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ اولٰئک ھم الصدیقون والشھداء عند ربھم (حدید)	جو لوگ کہ اللہ اور اس کے رسول پہ ایمان لائے وہی لوگ صدیق و شہید اپنے رب کے پاس ہیں ۔

قرب و صدیقیت کے افکار و نظریات ، معتقدات و احکام شرعیہ کے سرمو مخالف نہیں ہو سکتے ۔ حضرت مجدد صاحب نے بھی اپنے مکتوب ۱۴۱ جلد اوّل میں لکھا ہے ۔

موافقتِ معارفِ باطن با علوم شرعیہ ظاہر	باطنی معارف اور علوم شریعت کے درمیان کامل طور

بتمام وکمال بحدیکہ در حقیر ونقیر مجال مخالفت نماندہ مقام صدیقیت است۔ کہ بالاتر مقام ولایت است فوق مقام صدیقیت مقام نبوت است علومی کہ نبی را علیہ الصلوٰۃ والسلام بطریق وحی آمدہ است صدیق را بطریق الہام منکشف گشتہ است درمیانِ ایں دو علوم فرق غیر از وحی و الہام نیست۔ پس مخالفت را چہ مجال باشد (الخ)

پر موافقت کا ہونا اور چھوٹے چھوٹے امور میں بھی مخالفت کا موقع نہ رہے۔ مقام صدیقیت ہے۔ جو تمام مقام ولایت سے بالاتر مقام ہے۔ مقام صدیقیت سے اوپر مقام نبوت ہے۔ وہ علوم جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر بذریعہ وحی نازل ہوتے ہیں صدیق پر بذریعہ الہام منکشف ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان وحی والہام کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہے۔ پس مخالفت کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

دین اور شریعت کی تعلیم یہی ہے کہ خالق ومخلوق کے صفات میں صرف مشابہت و مشارکت اسمی ہے اور حق تعالیٰ وراء الورا ہے۔ عیب ہے تشبیہ وتقید سے بھی منزہ ہے اور صرف وہی (صفات کمالیہ وجودیہ) اسمائے حسنیٰ سے متصف ہے۔ خلق میں جو صفات وجودیہ حیات وسمع وبصر پائے جاتے ہیں مخلوق ہیں۔ یہی علم وحی ہے۔ خالق ومخلوق، عبد ورب کو بلحاظ وجود وصفات ایک کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ حق تعالیٰ ایک مرتبہ میں خالق ہیں اور ایک مرتبہ میں مخلوق۔ وہی عابد ہیں وہی معبود، وہی شاہد ہیں وہی مشہود۔ حضراتِ صوفیاء کے بھی یہی اقوال ہیں۔ حق تعالیٰ ایسی تمام باتوں سے سبحان ہیں اور وراء الورا ہیں۔ کشفی امور کو بطور وحی تسلیم کر لینا اور اس کی صحت وعدم صحت کو قرآنی دعوت کے معیار پر نہ جانچنا اور آیات محکمات کو اس کی صحت کا معیار نہ قرار دینا وابستگان کتاب وسنت کا شعار نہیں ہو سکتا۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

لان کل حقیقۃ لاتشھد لھا الشریعۃ فھی زندقہ (مجلس وعظ ۳۴)

وہ حقیقت جس کی شہادت شریعت نہ دے زندقہ ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت کا یہ ارشاد بھی غور و توجہ کے قابل ہے۔

طر الی الحق عزّ وجلّ بجناحی الکتاب والسنّۃ (الخ) — کتاب و سنت کے دو بازوؤں سے حق تعالیٰ کی طرف پرواز کر۔

۱۱۔ مخلوق، معلوم کو حق تعالیٰ اپنا غیر ثابت فرما رہے ہیں۔ پورا قرآن اس سے معمور ہے پھر یہ کہنا کہ "معلوم دراصل عالم ہی تو ہے"۔ دانشِ حق کی صریحاً مخالفت ہے۔

۱۲۔ قرآن کریم میں "الٰہ باطلہ" کو غیر اللہ فرمایا گیا جو مخلوق ہے۔

ام لهم اله غير الله۔ — کیا غیر اللہ ان کا الٰہ ہے

صرف وجود و صفات و افعال کی جہت سے اہل باطل بعض افرادِ خلق کو الٰہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان میں غیر معمولی کمالات کو دیکھ کر اللہ کے علاوہ ان کو بھی الٰہ مانتے تھے۔ ان کے غیر اللہ ہونے کے معنی یہی ہیں کہ وہ اپنی صفاتِ حیات و سماعت وغیرہ کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے بالکل غیر ہیں۔ انہیں حق تعالیٰ کے اصلی صفات نہیں ہیں۔ اصلی مان کر جو تقیدی غیریت ثابت کی جاتی ہے وہ صرف ذہنی چیز ہے۔ تقید و تشبیہ کا مطلب یہی ہے کہ "بصورت معلوم عالم ہی ظاہر ہے"۔ خالق ہی بصورت خلق موجود ہے۔ اور قرآن کی محکم آیتوں میں معلوم کو مخلوق و موجود کہا گیا ہے یہ ایک نقشِ خیالی ہو کر رہ جاتا ہے ایسی خیالی باتیں حقیقت و عرفان نہیں ہو سکتیں۔ حقیقت اور صحیح عرفان وہی ہو سکتا ہے جس میں معلوم کا مخلوق وذی حیات، ذی سماعت، ذی بصارت ہونا متحقق ہو، جس کو اللہ جل شانہٗ نے موجود کیا ہے اس کا وجود بھی ایک حقیقت ہے حق و خلق کے وجود صفات کی مغائرت سمجھ میں نہ آئے تو یہ ثابت کرنا کہ حق و خلق کا وجود ایک ہی ہے صرف صورت و بے صورتی، اطلاق و تقید کا فرق ہے۔ اللہ ہی معلوم کی صورت میں حیؔ و سمیع و بصیر ہیں۔ متشابہات کی ایسی توجیہ ہے جو محکمات کے بالکل خلاف ہے۔

محکمات، متشابہات محکمات وہ آیات ہیں جس میں دین کی تمام اصولی تعلیم ہے۔ جن کا تعلق عقائد

واعمال وجزاءِ اعمال سے ہے اور جس میں عبد و رب کے فطری و ابدی تعلق اور اس کے مقتضیات کو واضح کیا گیا ہے اور جو عبد و رب کے تعلق پہ قطعی دلیلیں اور مدارج بندگی کے علوم کا مخزن ہیں۔

آیاتِ متشابہات کے متعلق حضراتِ علماء کی مختلف توضیحات کا لب لباب یہ ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی جن کا کوئی ایک مطلب و مفہوم متعین نہیں کیا جاسکتا اور جن کے ایک معین معنی بیان کرنے سے عقلِ انسانی قاصر ہو اسی لئے شارع علیہ السلام نے آیاتِ متشابہات کی تاویل و پیروی سے منع فرما دیا اور اس پہ صرف ایمان رکھنے کا حکم دیا ہے

اس ناچیز کی رائے میں آیاتِ متشابہات وہ آیات ہیں جن سے عبد و رب کے صفات میں مشابہت و مشارکت معلوم ہوتی ہے اور جن سے خالق کے صفات اور مخلوق کے صفات ایک جیسے ہونے کا گمان ہوتا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اور بی بی مریم کو اہل کتاب نے اسی اشتباہ کی وجہ سے رب و الٰہ قرار دیا تھا۔ جسے قرآن مجید نے کفر و شرک قرار دیا آیاتِ متشابہات کی یہ تعریف قرآن مجید ہی سے اخذ کی گئی ہے۔

ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہٖ فتشابہ الخلق علیہم (الرعد ۱۶)	کیا انھوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی (کسی چیز کو) پیدا کیا جیسا خدا پیدا کرتا ہے پھران کو پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو۔

اس آیت سے واضح ہے کہ انسان میں شے سے شے بنانے کی جو قابلیت قدرت کی طرف سے ودیعت ہے اسکو اللہ کی صفتِ خالقیت سمجھا گیا اور اس طرح مخلوق کو اللہ کی صفتِ خالقیت میں شریک قرار دیا گیا۔ آیاتِ متشابہات کی اس توضیح پہ سورۂ انعام کی اس آیت سے بھی روشنی پڑتی ہے جس میں اللہ جل شانہ، نے مختلف فواکہات کا ذکر فرمایا ہے۔

متشابھاً وغیر متشابہٍ	ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے۔

یعنی وہ میوے جو صورتاً ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ مگر رنگ و بو و ذائقہ کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اسی طرح خالق و مخلوق کے صفات میں مشارکت و مشابہت لفظاً و صورتاً

ہیں وہ معنیً و حقیقتاً ایک نہیں ہیں۔ اور ان میں بالکل مغایرت ہے واقعہ یہ ہے کہ ظاہری مشارکت و مشابہت کو دیکھ کر خالق و مخلوق کی صفات کو ایک قرار دینا انسانی فہم وعقل کا قصور ہے۔ غالباً اسی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر اہل ایمان کو ان کے معنی و مفہوم متعین کرنے سے منع کر دیا گیا تاکہ وہ لغزش علمی سے محفوظ رہیں۔ لغزش علمی، لغزش عملی سے زیادہ خطرناک اور مضر ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جن کو علم دین میں رسوخ عطا کیا گیا ہو اگر آیات متشابہات کی توضیح کریں اور وہ قرآنی دعوت اور آیاتِ محکمات کے معارض اور مغائر نہ ہو تو قبول کیجا سکتی ہے لیکن جس سے قرآنی دعوت کا منشاء و مقصد فوت ہو اور آیاتِ محکمات کے بالکل خلاف ہو اس کو محض اس بنا پر قبول کر لینا کہ بیان کرنے والے صاحب کشف و الہام ہیں۔ کتاب و سنت سے صحیح وابستگی نہیں ہے۔ کشف و الہام و خواب کو کتاب و سنت کی معیار پر نہ جانچنے سے دین میں نئی نئی باتیں داخل ہو گئیں۔ علمی و عملی بدعات و مخترعات سے ہم اسی وقت محفوظ رہ سکتے ہیں جبکہ ہماری نظر صرف کتاب اللہ و سنت اور آثارِ صحابہ رضؓ پر ہو۔ فرمایا آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے

من یعش منکم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین (الخ) مشکوٰۃ	جو شخص زندہ رہیگا تم سے میرے بعد قریب ہے کہ وہ بہت اختلاف دیکھیگا پس لازم پکڑو کہ تم میرے طریقے اور میرے خلفاء کے طریقہ کو جو نیک راہ پر ہیں اور سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔

آیاتِ متشابہات کے متعلق چھٹی صدی ہجری کے عارف و بزرگ دین حضرت رفاعی علیہ الرحمۃ کے ایک ارشاد کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جس سے ایک حد تک یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین کا کیا مسلک رہا۔ حضرت کی کتاب "البرہان المؤید" کا ترجمہ "رسالہ الہادی" میں شائع ہو رہا ہے۔ یہ رسالہ کتب خانہ اشرفیہ جامع مسجد دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ جو غالباً مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ کا حلقہ ہے۔ حضرت کا ارشاد ہے

"پس اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ سلف صالحین کی طرح یوں کہا جائے کہ ہم ان متشابہات کے ظاہر پر ایمان لاتے ہیں اور مراد کے علم کو اللہ و رسول کے حوالے کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کو کیفیّت سے اور مخلوقات کے عیوب سے پاک بھی سمجھتے ہیں پیشوایان سلف اسی راستہ پر چلتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں جو اپنی صفت بیان فرمائی ہے ہمارا کام اس کو پڑھ لینا اور خاموش رہنا ہے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو ان کی تفسیر کا حق نہیں ہے۔ تم کو چاہیئے کہ متشابہات کو محکم پر محمول کرو کتاب اللہ میں اصل وہی آیات ہیں۔ متشابہ محکم کے معارض نہیں ہو سکتا۔ ایک شخص نے امام مالک رضی اللہ عنہ سے "الرحمٰن علی العرش استویٰ" کا مطلب پوچھا۔ امام مالک نے فرمایا استوا، تو معلوم ہے مگر اس کی کیفیت عقل میں نہیں آسکتی اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کی تحقیق و تفتیش کرنا بدعت ہے۔"

اس ارشاد سے حسب ذیل امور واضح ہوتے ہیں۔

۱۔ آیاتِ متشابہات میں وہ آیات بھی ہیں جس میں اللہ کے صفات بیان ہوئے ہیں اور مخلوق کے صفات کے لئے بھی وہی الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔

۲۔ متشابہ محکم کے معارض نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اللہ جل شانہ کی کسی صفت یا شان کی تحقیق بدعت ہے۔ بدعت اس نئی بات کو کہتے ہیں جس کی دلیل کتاب وسنت نہ ہو نہ آثار صحابہ میں اس کا پتہ چلتا ہو اس کے بدعت کہنے کا مطلب یہی ہے کہ سنن و آثار صحابہ سے حق تعالیٰ کی کسی صفت یا شان کی تحقیق ثابت نہیں ہے۔ حضرت رفاعیؒ نے اس سلسلہ میں حضرت امام ابن امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی نقل فرمایا ہے۔

"جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ کسی شے میں ہے یا کسی شے سے ہے یا کسی شے پر ہے تو وہ مشرک ہو گیا ہے"۔

غرض عبد و رب کے وجود و صفات کو ایک قرار دینا نہ کتاب و سنت اور آثار صحابہ کرام سے ثابت ہے اور نہ حضرات تابعین اور متقدمین کا مسلک ہے بلکہ حضرت امام مالکؒ کے قول سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسی تحقیق بدعت ہے۔

۱۴۔ قرب وصدیقیت کے علوم یعنی اللہ جل شانہ کی احاطت و معیّت، قرب و اقربیت کی جو تعلیم صدیوں سے رائج ہے اور جس کی تعبیر تجلی و تمثل سے کی جاتی ہے یا آیتِ امانت کی مروجہ تعبیر نہ حضرت مدینۃ العلم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور نہ "باب العلم" کرم اللہ وجہہٗ سے کوئی روایت ہے۔ حالانکہ تمام طریقہ چشتیہ، قادریہ وغیرہ کا سلسلہ سیدنا علی سے ثابت کیا جاتا ہے البتہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ جو آنحضرت اور حضرات خلفاء راشدینؓ کے فیض صحبت سے مشرف تھے۔ آپ سے امانت کی جو تعبیر مروی ہے وہ علم شریعت ہے اور اکثر علماء و محدثین کا اس پر اتفاق ہے یعنی امانت صرف "علم شریعت" کو فرمایا گیا ہے نہ کہ صفتِ علم کو۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے بھی احکام شریعت کو امانت فرمایا ہے۔

احکام الشرع امانة عندکم فقد ترکتموها وخنتم فیها۔	شریعت کے احکام تمہارے پاس امانت ہیں جس کو تم نے ترک کیا اور اس میں خیانت کی۔

امانت کی اس تعبیر کو حجت قرار دے کر یہ فرمانا کہ "شریعت میں علم ہے اور جب علم ایک صفتِ الٰہی امانت ہے تو تمام صفات الٰہی کا انسان کے پاس امانتاً ہونا ثابت ہو گا"۔ صحیح نہیں ہے کیونکہ ملائکہ اور اجنّہ کے لئے بھی علم ثابت ہے۔ اگر صفتِ علم کو امانت قرار دیا جائے تو ملائکہ اور اجنّہ کا بھی حاملِ امانت ہونا لازم آتا ہے حالانکہ حامل امانت صرف انسان ہے۔

نیز قابل غور یہ ہے کہ الفاظ اور کلام ہی کے ذریعہ ایک انسان دوسرے انسان سے

علم سیکھ رہا ہے۔ بچہ کو اگر اشیاء کا علم نہ سکھایا جائے تو وہ جاہل ہی رہتا ہے۔ اگر اس کو ایسے مقام پہ رکھا جائے جہاں انسانوں کی بود و باش اور آمد و رفت نہ ہو تو بچہ بات کرنا بھی نہیں سیکھ سکتا حالانکہ اس میں وجود، حیات، سماعت، بصارت وغیرہ جملہ صفات ہوتے ہیں مگر علم جب تک خارج سے حاصل نہ کرے وہ کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے یہ فرمانا کہ جہاں علم ہے وہیں علیم کا بھی ہونا ضروری ہے منطقی نتیجہ ہو تو ہو حقیقت نہیں ہو سکتی۔ قرآنی علم کا نزول فرشتہ کے ذریعہ ثابت ہے تو کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ علم جو ایک صفت ہے جیسے فرشتہ لے کر نازل ہوتا ہے وہ فرشتہ علم اور علیم دونوں کو لے کر نازل ہوتا ہے ظاہر ہے کہ یہ کتنی بے معنی بات ہے اللہ جل شانہٗ کے علم سکھلانے سے انسان کا علم سیکھنا قرآن سے ثابت ہے۔

انہ لذو علمٍ لما علمنٰہ (سورہ یوسف)	وہ بڑے عالم تھے کیونکہ ہم نے ان کو علم سکھلایا تھا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

علم الانسان مالم یعلم	انسان کو سکھلایا جو وہ نہیں جانتا تھا (دوسرے انسانوں کے ذریعہ یا الہام والقا اور وحی کے ذریعہ)

اور محکمات سے تو یہ ہے کہ اللہ علیم ہر ذی علم سے بالاتر اور غالب ہیں نہ کہ ہر ذی علم کی صورت میں موجود ہیں۔

وفوق کل ذی علمٍ علیم۔	اور تمام علم والوں کے اوپر ایک علم والا ہے۔

۱۴۔ حق تعالیٰ کے متعلق مسلّمات سے ہے کہ وہ غیب الغیب اور ورا الورا ہیں ساقط الاشارات ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذات و صفات کا انفکاک ممکن نہیں ہے جب ذات غیب ہی غیب ہے تو صفات و افعال بھی غیب ہی غیب ہیں۔ محض الفاظ کی مشابہت کو دیکھ کر مخلوق میں صفاتِ حق کو ثابت کرنا اور حق تعالیٰ کو مخلوق کی صورت میں موجود سمجھ کر غیب کو "شہود" سمجھنا اپنے مسلمات کا انکار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عالم خلق میں حق تعالےٰ

کے اسماءِ حسنیٰ کے آثار ہیں۔ جس کو متعدد جگہ کلام مجید میں آیات اللہ فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

ان فی السمٰوٰت والارض لاٰیٰتٍ للمؤمنین وفی خلقکم ومایبث من دابۃٍ اٰیٰت لقوم یوقنون (الجاثیہ)	آسمانوں اور زمین میں اہل ایمان کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اور جانداروں کے پیدا کرنے میں جو زمین پر پھیلے ہوئے ہیں بہت سی نشانیاں ہیں ان کیلئے جو یقین رکھتے ہیں

آیت کے معنی حکم و نشان ہے نہ کہ صفات و وجود، اپنے صفات کو اللہ جل شانہ نے جن الفاظ سے ظاہر فرمایا ہے۔ مخلوق کے صفات کے لئے بھی وہی الفاظ استعمال فرمائے ہیں اس لفظی و اسمی مشارکت سے مخلوق کی صفات کو صفاتِ حق قرار دینا اور غیب کو شہود سمجھنا خشی الرحمٰن بالغیب کی صریحاً مخالفت ہے۔ رحمانیت اللہ کی ایک جامع صفت ہے قرآن سے اس کا غیب ہونا ثابت ہے (غیب کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کیفیت یا شان کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے احکام و آثار کو دیکھ کر اس پر یقین رکھا جا سکتا ہے)

۱۵۔ قیومیتِ الٰہی، اسم حسنٰی "القیوم" کی اس طرح تفہیم کی جاتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے معلوم کی صورت میں موجود ہو کر اس صورتِ معلومہ کو قائم کئے ہوئے ہیں۔ اور بڑی جرأت کے ساتھ مٹی کے ظروف یا لکڑی کے سامان کی مثال دے کر سمجھایا جاتا ہے کہ جس طرح صراحی کی صورت کو مٹی یا کرسی و میز وغیرہ کو لکڑی قائم کئے ہوئے ہے اسم الٰہی "القیوم" کا یہ مطلب و مفہوم اس آیۂ کریمہ کی روشنی میں غور کیا جائے کہ کس حد تک درست ہے۔

ومن اٰیٰتہٖ ان تقوم السماء والارض بامرہٖ (الروم ۴)	اور اسی کی نشانیوں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ اللہ جل شانہ، مخلوق کی صورت میں خود موجود ہو کر اس کو قائم کئے ہوئے ہیں اور حق تعالیٰ فرماتے ہیں ارض و سما جس میں تمام مخلوق بھی شامل ہے وہ بحکم الٰہی قائم

ہیں۔ اور بحکم الٰہی اُن کے قیام کو اپنی قدرت کاملہ کی نشانی فرماتے ہیں۔ قیومیت کا مفہوم اس آیت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مخلوقات کو ہستی و بقا، کا شرف صرف اللہ جل شانہٗ کے ارادہ و حکم سے حاصل ہے نہ کہ تجلّی و تمثّل سے۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہی معرفت ہے۔

اجتهدوا فی تحصیل معرفة الحق عزوجلّ فانها غیبة معه وقیام مع قدره وقدرته وعلمه (مجلس وعظ ۵۸)

حق تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرو وہ معرفت حق تعالیٰ کے ساتھ غیبت ہی ہے اور اس کی تجویز و قدرت و علم سے قائم رہنا ہے۔

معیتِ حق کا مفہوم حضرتؒ کے نزدیک وہ نہیں ہے جو عرفان مروجہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ بلکہ حضرت معیتِ حق کو بلاکیفیت و بلاتشبیہ بیان فرماتے ہیں۔

فیصیر صاحب هذا القلب فی خلوته مع الحق عزوجلّ فی جمیع احواله من غیر تکییف ولا تشبیه لیس کمثله شئ وهو السمیع البصیر (وعظ ۲۳)

ایسا قلب والا شخص اپنے خلوت کے اندر ہر حالت میں اللہ کے ساتھ ہے بلاکیفیت اور بلاتشبیہ کے۔ کیونکہ اُس کی مثل کوئی شئی نہیں ہے۔ اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

حضرت تشبیہ کی صرف نفی ہی نہیں فرماتے ہیں بلکہ تنزیہ حق پر آیتِ لیس کمثلہٗ سے استدلال فرماتے ہیں اس آیت سے سلوک مروجہ میں حق تعالیٰ کے لئے تشبیہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی رنگین عینک آنکھوں پر رکھ لی جاتی ہے تو ہر چیز رنگین نظر آتی ہے۔

۱۶ ۔ بزرگانِ دین کو مختلف مراقبے و مشاغل کے نتیجے میں ایک نور لطیف مکشوف و مشہود ہوا اسی نور سے مختلف صورتیں بنتی اور بگڑتی نظر آئیں انہوں نے اس نور کو نورِ ذات سمجھ کر اسم "الظاهر" کی توجیہ اس کے مطابق کر دی اور قربِ حق کا تمام سلوک اسی کے تحت کر دیا۔ نورِ مکشوف کو نورِ ذات قرار دینے کی کیا دلیل ہے؟

جبکہ قرآن مجید سے ایک نور کا بھی مخلوق ہونا ثابت ہے۔

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ (الانعام) ۱	اور تاریکیوں اور نور کو بنایا۔

لفظ نور مخلوق کے لئے بھی استعمال فرمایا گیا اور خالق کے لئے بھی۔ اس لفظی واسمی مشابہت سے کسی اجتہادی غلطی کا واقع ہو جانا کیا کوئی ان ہونی بات ہے؟ کوئی اپنے نور مکشوف کو نور ذات سمجھ کر اسی خیال میں مست و مدہوش رہے تو رہ سکتا ہے۔ مگر دوسروں کے لئے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ اس کو قرآنی حقیقت سمجھ کر علم وحی کی طرح اس پر یقین رکھیں اور اسی کو کمال دین سمجھ کر اس کی اشاعت کرتے رہیں۔ یہ ایک بڑی ذمہ داری ہے۔ ذمہ داری کا احساس نہ کرنا اہل حق کا وصف نہیں۔

۱۷۔ سلوک میں سب سے اعلیٰ درجہ کی بات یہ کہی جاتی ہے کہ ظاہراً و باطناً اللہ ہی موجود ہیں یعنی مختلف اشکال وصور میں اللہ جل شانہٗ ہی "حی و سمیع و بصیر و قدیر" ہیں اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ "مخلوق کی عبادت کرنا اللہ ہی کی عبادت ہے۔ اور مخلوق کو جو سجدہ کیا جا رہا ہے اللہ ہی کو سجدہ کیا جا رہا ہے"۔ حالانکہ قرآن مجید اس پر ناطق ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے "معلوم" کو سمیع و بصیر بنایا ہے۔

جَعَلْنٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝	ہم نے اس (انسان) کو سمیع و بصیر بنایا۔

اور سورہ مریم میں ارشاد ہے

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا	کیا تم کسی کو اس (اللہ) کا ہم صفت سمجھتے ہو۔

ان دونوں آیتوں پر ایک ساتھ غور کیا جائے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ مخلوق بھی سمیع و بصیر ہے اور یہ کہ مخلوق خالق کی ہم صفت نہیں اور نہ مخلوق کی صورت میں خالق ہی سمیع و بصیر ہے۔ محض متشابہ الفاظ کو دیکھ کر اللہ کے صفات کو مخلوق میں بھی ثابت کرنا انسان کی ایک باطل ذہنیت ہے اللہ علیم و خبیر ہے۔ قرآنی بصیرت حاصل کر کے باطل ذہنیت کی تردید کرنے کے بجائے اس ذہنیت کو صحیح قرار دیا گیا جس کے بعد

مشکل یہ پیش آئی کہ اس شرک کو کس طرح رفع کیا جائے کیونکہ اگر ان صفات کو مخلوق میں ثابت کیا جاتا ہے تو یہ صریحاً شرک ہے اور اگر ان کا انکار کیا جائے تو مشاہدہ اور قرآن کے خلاف ہے جو کفر ہے۔ کشف کی راہ سے اس کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی گئی اور جو حل دریافت ہوا وہ کس قدر غیر واقعی ہے۔ یعنی در اصل مخلوق، موجود، سمیع بصیر نہیں بلکہ اللہ ہی تقییداً و تشبیہاً موجود اور سمیع و بصیر ہیں۔ اہل کشف کے لئے یہ ایک اجتہادی غلطی ہے اور ہمارے لئے جامد تقلید ہے۔

نہ معلوم کس کا شعر ہے مگر خوب فرمایا ؎

آنانکہ حسنِ روئے تو تفسیر می کنند ❖ خواب ندیدہ راہمہ تعبیر می کنند

شریعت نے افرادِ خلق کی عبادت کو باطل اسی لئے قرار دیا کہ بلحاظ وجود و صفات خلق و حق ایک نہیں ہے۔ خلق و حق کو عین یکدیگر سمجھ کر خلق کی عبادت کرنا باطل ہے اور ہر مرتبہ میں صالحیت ہو یا صدیقیت باطل ہے۔

۱۸۔ سورۂ مائدہ کی آیت ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (الخ)	بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہ مسیح ابن مریم ہی ہیں۔

اس آیت کی توضیح میں مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

"نصاریٰ میں دو قول ہیں۔ بعضے کہتے ہیں اللہ ہی تھا جو مسیح کی صورت میں آیا" الخ) (موضح القرآن)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ معجزہ کہ صرف ماں سے پیدا ہوئے اور دوسرے معجزات احیاء موتیٰ وغیرہ کو دیکھ کر نصاریٰ نے یہی خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ ہی حضرت مسیح کی صورت میں موجود ہوا ہے اور غالباً ہنود بھی مصلح، پیغمبر کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں، اسی لئے ہندی زبان میں مصلح، پیغمبر کو اوتار کہا جاتا ہے۔ یعنی "خدا ہی زمین پر بندوں کی اصلاح

کے لئے بندوں کی صورت میں اترتا ہے" غرض یہ انسانی تخیل کہ " اللہ بندہ کی صورت میں ظاہر ہے" جس کو تجلی کہا جاتا ہے حق تعالیٰ اس کو کفر قرار دے رہے ہیں اور اس کے بعد ہی حق تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے رہے ہیں ۔

قُل فمن یملك من اللّٰه شیئاً ان اراد ان یھلك المسیح ابن مریم وامہٗ ومن فی الارض جمیعا (۶)	آپ پوچھیے اگر ایسا ہے تو یہ تبلاؤ اگر اللہ مسیح ابن مریم اور ان کی والدہ کو اور جتنے زمین پر ہیں ان کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اُن کو بچا سکے ۔

اس سوال کا منشا یہی ہے کہ مخلوق جس کو اللہ تعالیٰ ہی پیدا اور ہلاک کرتے ہیں وہ اللہ کی تجلی نہیں، اللہ اور مخلوق کو کسی لحاظ سے عین یکدیگر سمجھنا یا ان کی صورت میں اللہ ہی کو ظاہر و موجود سمجھنا قرآنی حقیقت نہیں ہے ۔کفر ہے، حقیقت کا انکار ہے یہ آیت اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ صرف کسی ایک صورتِ خلق میں اللہ کو موجود و ظاہر سمجھنا یا اللہ جل شانہٗ کو کسی ایک ہی فردِ خلق کا عین سمجھنا کفر نہیں ہے ۔بلکہ تمام افرادِ خلق کے متعلق ایسی دانش رکھنا کفر ہے ۔اس سورۃ کے دسویں رکوع میں اس عقیدہ کو شرک فرمایا گیا ہے ۔ دانشِ حق کے خلاف عقیدہ رکھنا ظاہر ہے کہ شرک و کفر ہے ۔ شرک یہی تو ہے کہ ایک بے حقیقت بات حقیقت سمجھی جاتی ہے ۔غور کیا جائے کہ قرآن مجید جس عقیدہ کو کفر و شرک قرار دے وہ توحید بلکہ توحید کا انتہائی مقام سمجھا جاتا ہے ۔

۱۹ ۔عرفانِ مروجہ کی تعلیمات کو انبیائی بصیرت کہا جاتا ہے ۔مگر قرآن مجید میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے جو واقعات بیان فرمائے گئے ہیں ۔ان کو بغور پڑھنے سے قطعاً اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ ان حضرات کی یہی بصیرت تھی ۔

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام شمس و قمر و کواکب کو دیکھ کر فرماتے ہیں ۔

لا احب الاٰفلین (الانعام)	میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۔

اشارتاً بھی یہ نہیں پایا جاتا کہ شمس و قمر میں جلوۂ جمالِ حق پر حضرت کی نظر تھی۔ کیونکہ اس کے بعد اپنی ذات کے متعلق آپ فرما رہے ہیں۔

لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین ۔ (الانعام)	اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاتا ۔

ظاہر ہے کہ اگر شمس و قمر کی صورت میں حضرت اللہ ہی کو جلوہ گر سمجھتے تو اپنے متعلق ہرگز یہ نہ فرماتے کہ مجھ کو ہدایت نصیب نہ ہوتی تو میں بھی گمراہ ہو جاتا ۔ کیونکہ سلوک مروجہ میں تو انتہا میں توحید ہی توحید ہے۔ ضلالت و ہدایت کا فرق تو ابتدائی نظر ہے۔ کاملین کے پاس یہ فرق باقی نہیں رہتا ۔ مگر حضرت ابراہیم کے ارشاد سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کواکب پرستی کو مطلقاً ضلالت فرما رہے ہیں۔ اگر عرفانِ حق یہی ہوتا کہ کواکب پرستی کو ایک مرتبہ میں شرک اور ایک مرتبہ میں توحید قرار دیا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اس سلسلے میں اپنے متعلق "وما انا من المشرکین" بھی نہ فرماتے ۔

۲ ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضرؑ کے پاس علم سیکھنے تشریف لے گئے تھے ۔

قال لہ موسیٰ ھل اتبعک علیٰ ان تعلمن مما علمت رشدا (الکہف)	موسیٰ نے ان سے کہا کہ کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں کہ جو علم ہدایت آپکو سکھلایا گیا ہے وہ آپ مجھ کو سکھلائیں ۔

اس کے بعد ان بزرگ کے ہر عمل کشتی میں سوراخ کرنا ، اور ایک لڑکے کو قتل کرنا ، وغیرہ کو دیکھ کر حضرتِ موسیٰ اعتراض فرماتے رہے حالانکہ ان سے علم سیکھنے کے لئے آئے تھے ۔ اگر انبیائی نظر و بصیرت یہی ہوتی کہ اللہ علیم ہی خضرؑ کی صورت میں ظاہر ہیں تو حضرت موسیٰؑ ان کے افعال پر ہرگز اعتراض نہ فرماتے اور ان کی صورت میں اللہ ہی کو فاعل و علیم سمجھ کر نظارۂ جمالِ حق فرماتے ہوئے خاموش رہتے ۔

۳ ۔ حضرت یوسف علیہ السلام قید خانہ میں قید ہیں ۔ والیٔ مصر اپنے خواب کی تعبیر سن کر آپ کو قید خانہ سے بلواتا ہے ۔ اگر حضرت یوسفؑ والیٔ مصر کی صورت میں اللہ ہی کو

جلوہ گر سمجھتے تو فوراً چلے جاتے ۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا ۔ اور جواب دیا کہ اس واقعۂ نامرضیہ کا تصفیہ کیا جائے جس کی وجہ سے آپ کو قیدخانہ میں رہنا پڑا ۔

قال ارجع الیٰ ربك فاسئله ما بال النسوة التی قطعن ایدیهن (یوسف)	فرمایا تو اپنے آقا کے پاس لوٹ جا پھر اس سے دریافت کر کہ ان عورتوں کا کیا واقعہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے

۲۹ ۔ سورہ ص میں حضرت سلیمان کا یہ واقعہ درج ہے کہ اپنے اصیل گھوڑے وغیرہ ملاحظہ کرنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ آفتاب غروب ہو گیا ۔ تو انہوں نے برہم ہو کر گھوڑوں کو اس لئے مارنا شروع کیا کہ میں اُن کی وجہ سے ذکرِ رب سے غافل ہو گیا ۔

فقال انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی حتیٰ توارت بالحجاب (ص)	کہنے لگے کہ میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا ۔ یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو گیا ۔

ہر شے میں اگر اللہ ہی ظاہر و موجود ہیں اور یہی بصیرت کمال دین و ایمان ہے تو حضرت سلیمانؑ یہ نہ فرماتے کہ میں ذکرِ رب سے غافل ہو گیا ، ہر شے میں شہودِ حق کے بعد غفلت کا سوال ہی باقی نہیں رہتا ۔ اور ایک نبی کے متعلق یہ تصور تو نہیں کیا جا سکتا کہ وہ شہودِ حق سے غافل ہو گئے ۔ لہٰذا حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے مذکورہ واقعات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر شئے میں حق تعالیٰ کو موجود و ظاہر سمجھنا نہ حقیقت ہے اور نہ انبیائی بصیرت ۔

۳۰ ۔ مسئلۂ وحدت الوجود کے مروجہ مفہوم کو ذہن نشین کرانے کیلئے مخلوق کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جیسے بحر و حباب و موج یا موم کی پتلیاں یا مٹی اور مٹی کے برتنوں کی مثال، حالانکہ حق تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے ۔ "لیس کمثله شیء" جب مخلوق کسی اعتبار سے بھی اللہ کی جیسی نہیں ہے تو پھر مخلوق کی مثالیں دے کر حق تعالیٰ کی کسی شان یا صفت کی حقیقت یا کیفیت کو بیان کرنا اس حکمِ الٰہی کی نافرمانی ہوگی ۔

فلا تضربوا لله الامثال	بس اللہ کے لئے مثالیں نہ بیان کرو ۔

مثالیں دے کر اللہ جل شانہٗ کے صفات و افعال کو مخلوق میں ثابت کرنا ایک تاکیدی

حکم کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ زبان عربی میں "ضرب مثل" کسی شئی کی حالت وکیفیت بیان کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ حق تعالیٰ وراء الورا رہیں نہایت اعلیٰ ولطیف ہیں۔ ان کی کسی شان یا صفت کے متعلق جو تصور بھی انسان اپنے ذہن میں قائم کرے گا چاہے وہ کشف ہی کی بناء پر کیوں نہ ہو اللہ اس سے بھی بالاتر ہیں۔ جیسا کہ خود ہی فرماتے ہیں۔

وللہ المثل الاعلیٰ	اللہ کی شان بہت اعلیٰ ہے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ کی قرب واقربیت و احاطت و ظاہریت و باطنیت کی کوئی کیفیت نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی اور نہ حضرات صحابہ نے آپؐ سے اس کی حقیقت وکیفیت کو دریافت فرمایا۔

۲۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو پیروں کے نیچے یا بازو تھوکو۔ سامنے مت تھوکو کیونکہ مصلّی اور کعبہ کے درمیان اللہ ہے

کتاب الصلوٰۃ باب المساجد

وان ربہ بینہ وبین القبلۃ فلا یبزقن احدکم قبل قبلتہ ولکن عن یسار او تحت قدمہ (الخ)	تحقیق رب اس (نمازی) کا درمیان اس کے اور درمیان قبلہ کے ہے نہ تھوکے کوئی تمہارا قبلہ کی طرف ولیکن تھوکے بائیں یا نیچے پاؤں کے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے اللہ نہ مصلی کی صورت میں ہے۔ اور نہ کعبہ کی صورت میں موجود و ظاہر ہے۔ پھر یہ کہنا کیوں کر صحیح ہوگا۔ کہ اللہ ہر شئی میں موجود و ظاہر ہے۔

۲۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام کی زندگی کے ایک دو واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ قاتلِ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت وحشی اسلام لانے کے بعد جب آنحضرتؐ کے پاس تشریف لاتے تو آپ ان کی طرف سے منہ پھیر لیتے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس بات کا اہتمام فرماتے کہ سوتے وقت منہ قبلہ رو

رہے۔ آپ کے اس عمل اور اہتمام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ آیہ کریمہ

فاینما تولوا فثمّ وجہ اللہ۔	تم جدھر منہ کرو ادھر اللہ کا رخ ہے۔

کے جو معنی عرفان مروجہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں ہیں۔ اگر ہر صورت میں اللہ ہی مشہود محسوس ہیں جیساکہ بیان کیا جاتا ہے تو صرف حضرت وحشی کی طرف سے نہ آپ اپنا منہ پھیر لیا کرتے اور نہ سوتے وقت ہمیشہ قبلہ رو سونے کا اہتمام فرماتے۔

۳۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ نے سیدنا عمرؓ کو کچھ عطا کیا۔ سیدنا عمرؓ نے فرمایا مجھ سے زیادہ محتاج کو دیجئے۔

عن عمر بن الخطاب قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعطینی العطاء فاقول لہ اعطہ افقر الیہ منی (مشکوٰۃ کتاب الزکوٰۃ)	روایت ہے عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو کچھ عطا کیا تو میں نے کہا کہ اس کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لے اس کو اور صدقہ دے" اور یہ بھی فرمایا اگر دنیا کی کوئی چیز بے سوال ملے تو لے لیا کرو اور جو اس طرح نہ ملے اس کے پیچھے نہ پڑو

اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے سیدنا عمرؓ جو مقام قرب حق و صدیقیت کے انسان ہیں انہوں نے آنحضرتؐ کی صورت مبارک میں اللہ جل شانہٗ کو معطی ہونا نہیں سمجھا تھا۔ ورنہ انکار نہ فرماتے نہ آنحضرت نے یہ فرمایا کہ میری صورت میں اللہ ہی کو معطی سمجھ کر قبول کر لو۔ لہٰذا اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہر صورت میں اللہ کو جلوہ گر دیکھنا حسب مفہوم مروجہ آنحضرتؐ اور صحابہ کی بصیرت نہیں تھی۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو منع فرما دیا تھا کہ کسی سے سوال نہ کریں اور یہاں تک تاکید فرمادی تھی کہ اگر کوڑا بھی زمین پر گر جائے تو خود اتر کر لے لو۔

عن ابی ذرؓ قال دعانی رسول اللہ	روایت ہے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے بلایا مجھے

صلی اللہ علیہ وسلم وھو یشترط علی ان لا تسأل الناس شیئاً قلت نعم قال ولا سوطک ان سقط منک حتیٰ تنزل الیہ فتاخذہٗ

(رواہ احمد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشروط کرنے کو اس پر کہ نہ مانگوں میں لوگوں سے کوئی چیز پھر کہا میں نے اچھا پھر فرمایا حضرت نے نہ مانگ اپنے کوڑے کو اگر گر جائے تیرے ہاتھ سے یہانتک کہ تو آپ اتر کر لے اس کو۔

آثارِ صحابہ سے ثابت ہے کہ اس تعلیم کے بعد حضرات صحابۂ کرام بہت کم کسی سے سوال کرتے تھے۔ راستہ چلتے اگر سواری سے کوڑا گر جاتا تو خود اتر کر لے لیتے مگر کسی سے سوال نہ کرتے، آنحضرتؐ کی یہ تعلیم اور صحابہ کا یہ عمل کیا اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ کہ ہر شئی، ہر انسان کی صورت میں اللہ ہی مشہود و محسوس ہونے کی تعلیم بصیرتِ محمدیہ نہیں ہے۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے حصولِ علم کی بہت ترغیب دلائی ہے اور علم کے بڑے فضائل بیان فرمائے، چنانچہ احادیث کی کتابوں میں ایک کتاب ہی "کتاب العلم" ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ عمل بھی ثابت ہے کہ ذکر کے کثیر فضائل کے باوجود آپ مجلس ذکر کے مقابلہ میں مجلس علم میں تشریف فرما ہوتے اور اس کو زیادہ پسند فرمانے کا اظہار بھی کیا۔ مگر باوجود اس کے قرب وصدیقیت کی مروجہ تعلیم آنحضرتؐ اور صحابۂ کرامؓ سے مروی نہیں ہے۔ اگر قرب وصدیقیت کا مروجہ مفہوم علم نبوت کا جزو ہوتا تو صحابہ کرام کی علمی مجالس میں اس کا تذکرہ صحیح روایات سے پایا جاتا۔ کیا یہ اس بات کی قوی دلیل نہیں ہے کہ یہ علوم بعد کی پیداوار ہیں۔

زمانہ نبوتؐ اور دورِ صحابہؓ میں ان علومِ اسرار کا چرچا نہ ہونے اور ان کا مستند روایات سے ثابت نہ ہونے کی یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کہ یہ "اسرار عوام کی سمجھ سے بالاتر تھے اور ان کو صراحتاً بیان کیا جاتا تو عوام گمراہ ہو جاتے اس لئے ان کو چھپایا گیا"۔ کیونکہ ایسی توجیہ

سے صحابہ کرام بلکہ خود نبوتؐ کے احترام کو ٹھیس لگتی ہے۔ ایسی باتوں سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے آنحضرت ہی کے زمانہ میں گمراہی پھیلنے کے امکان کو ثابت کرنا بڑی سوءِ ادبی ہے۔ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت جن کو نصیب ہوا اور جو براہ راست اس مخزنِ علم و حکمت سے استفادہ کرتے ہوں بنیادی مسائل (عقاید) کو سمجھ لینے کے مواقع رات دن جن کو حاصل ہوں ان کے متعلق گمراہی میں مبتلا ہونے کا کوئی تصور پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ عجیب بات ہے کہ بعد کا زمانہ جو دین و ایمان کے انحطاط اور عقاید کے اضمحلال کا زمانہ ہے اس زمانہ میں اگر یہ یہ اسرار ہر مجلس اور ہر بزم میں موضوع گفتگو رہیں ہر کہ و مہ کے سامنے بیان کئے جائیں کتابوں کے اوراق اس سے مزین کئے جائیں تو گمراہی پھیلنے کا کوئی احتمال پیدا نہیں ہوتا مگر آنحضرتؐ اور صحابہ کرامؓ کے درخشاں دور میں گمراہی پھیلنے کا خوف تھا۔ اس لئے اُن کو چھپانا ضروری سمجھا گیا۔ غور کیا جائے کتنا مہمل خیال ہے واقعہ یہ ہے کہ قرآنی حقائق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کی تعلیمات گمراہ کن نہیں ہو سکتے یہ کشفی اسرار چونکہ قرآنی حقائق نہیں ہیں۔ اس لئے ان کی اشاعت کے بعد سے گمراہی، الحاد و زندقہ پھیلتا گیا اور شریعت کی روح مفقود اور اس کا اصلی مقصد فوت' اور شریعت کا وقار بھی قلوب سے زائل ہوتا گیا۔ اگر بزرگوں نے نیک نیتی سے اس پر غور نہیں فرمایا، اور ایک دوسرے پر اعتماد کرتے چلے آئے اور کشفی اسرار کو قرآنی معیار پر جانچنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ تو اُن کا یہ عمل عرفان مروجہ کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ دیکھنا یہ نہیں ہے کہ فلاں بزرگ کو کیا کشف ہوا، اور انہوں نے کیا لکھا اور کیا کہا۔ غور کرنا یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے کیا فرمایا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ارشاد ہے اور حضراتِ صحابہ کرامؓ کی کیا دانش تھی، اور اُن کا طریقہ عمل کیا تھا، جو خیال دماغوں میں بزرگوں کے ارشادات سے جم چکا ہے قرآن کریم کی مختلف آیتوں اور مختلف احادیث کے ٹکڑوں سے اس کی

تلاش کرلی جائے تو وہ قرآنی حقیقت نہیں بن سکتا۔

قرآن فہمی کے اصول

قرآن مجید کے حقائق کو سمجھنے کا اصولی طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی ایک محکم آیت کی تفسیر دوسری محکم آیتوں سے کی جائے کیونکہ قرآن کی ایک آیت پورے قرآن سے مربوط ہوتی ہے۔ اور آیاتِ محکمات ہی علم کی نہریں ہیں، قرآن مجید ہی سے مخاطبین قرآن کے افکار و خیالات کا پتہ لگانا اور اُن کے شکوک و شبہات کو معلوم کرنا بھی لازمی ہے۔ قرآنی دعوت اور نزول قرآن کے مقصد کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جس کا تعین بھی قرآن مجید ہی سے کیا جائے۔ قرآن ہی سے انسان اور انسان کی فطرت کو بھی سمجھنا چاہیئے۔ آنحضرتؐ کے صحیح ارشادات، آپ کا اسوۂ حسنہ اور صحابۂ کرامؓ کے طریقۂ عمل کو بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے۔ ان تمام امور کو سامنے رکھے بغیر کوئی شخص قرآنی حقائق کو نہیں سمجھ سکتا۔ ان شرطوں کے علاوہ اہم اور مقدم شرط تو یہ ہے کہ احتیاج عملی کی نسبت اللہ علیم وخبیر سے قائم ہو جائے۔ جس کے بعد علم کا فیضان جاری ہو جاتا ہے۔ اور کلامِ الٰہی سے جو مرادِ الٰہی ہے وہ واضح ہوتی جاتی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب و معیّت کی جن آیتوں سے عرفان مروجہ کو ثابت کیا جاتا ہے ان کے منشاء و مراد کو متعین کرنے میں اصول متذکرہ صدر کو کما حقہٗ پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ایسی چند آیتوں کو ایک سلسلہ سے لکھ کر بلحاظ سیاق و سباق ان کا جو مطلب ہے قرآن ہی سے متعین کیا جاتا ہے۔ اور دو مشہور حدیثیں، حدیث احسان و حدیث قرب نوافل کا جو مطلب بعض اکابر نے بیان فرمایا ہے اور جو عرفان مروجہ کے مغائر ہے وہ بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔

آیاتِ قرب و معیّت و احادیث کا مطلب

(۱) سنریهم ایٰتنا فی الآفاق وفی انفسهم حتیٰ یتبین لهم انه الحق ط اولم یکف بربك انه

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں ان کے گرد و نواح میں دکھائیں گے اور ان کی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائیگا کہ وہ (قرآن) حق ہے کیا آپ کے رب کی

علیٰ کل شیءٍ شہید ۵ الا انہم فی مریۃ من لقاء ربہم ط الا انہ بکل شیءٍ محیط ۵ (حم سجدہ ع ۶)	یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے کی طرف سے شک میں پڑے ہیں یاد رکھو کہ وہ ہر چیز کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔
(۲) وھو معکم این ما کنتم (الحدید)	(۲) اور وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم کہیں بھی ہو۔
(۳) ونحن اقرب الیہ من حبل الورید (سورہ ق)	(۳) اور ہم انسان کی رگ گردن سے بھی قریب ہیں۔
(۴) ھو الاول والآخر والظاھر والباطن وھو بکل شیءٍ علیم (سورہ الحدید)	(۴) وہی پہلے ہے اور وہی پیچھے وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔
(۵) واذا سألک عبادی عنی فانی قریب (البقرہ ع ۲۳)	(۵) اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کرتے ہیں تو (آپ میری طرف سے فرما دیجئے) میں قریب ہی ہوں
(۶) واللہ معکم	(۶) اللہ تمہارے ساتھ ہیں۔
(۷) فاینما تولوا فثم وجہ اللہ	(۷) تم جس طرف منہ کرو بس اُدھر اللہ کا رخ ہے۔
(۸) وفی انفسکم افلا تبصرون (الذاریات)	(۸) اور تمہاری ذات کے اندر پس کیا تم نہیں دیکھتے۔

ان آیات کے مطالب متعین کرنے اور کلامِ الٰہی سے مرادِ الٰہی کو سمجھنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کے اولیں مخاطب بنی آدم کے دو ہی گروہ تھے ایک تو وہ حضرات جنہوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا تھا اور دوسرا وہ گروہ جو دعوتِ حق کا منکر تھا۔ دعوتِ حق کا تعلق انسان اور اس کی عارضی و ابدی زندگی سے ہے۔ توحید اور حیاتِ آخرت کا صحیح علم و یقین ہی انسانی زندگی کے لئے آبِ حیات ہے۔ اس کے بغیر نہ انسان اپنی فطرتِ سلیمہ پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور نہ فلاحِ دارین حاصل کر سکتا ہے۔ جو لوگ قرآنی دعوت کے منکر تھے ان کے باطل خیالات و افکار کو قرآن مجید ہی کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے تاکہ آیاتِ مذکورہ بالا کے مطالب کو سمجھنے میں سہولت ہو۔

دعوتِ حق کا انکار کرنے والے خدا کو اپنا خالق و... ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ زندگی کے کاروبار کو وہ خدا کی ہدایت کے بغیر امن و سلامتی سے انجام دے سکتے ہیں۔ خدا نے بندوں کو کسی بات کا پابند نہیں کیا ہے۔ اسی بنا پر وہ خدا کی طرف سے احکام و ہدایت کے نازل ہونے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

قالوا ما انتم الا بشر مثلنا وما انزل الرحمٰن من شیءٍ۔ (یٰسین)	اُن لوگوں نے کہا تم ہماری طرح ایک معمولی آدمی ہو خدائے رحمٰن نے کوئی چیز نازل نہیں کی۔

افکار و اعمال کی عارضی و ابدی جزا کا جو اٹل قانون اللہ جل شانہٗ نے نافذ کر دیا ہے۔ اور جو اسم رحمٰن کی ایک خاصیت و اثر ہے اس کو سمجھنے سے ان کے دماغ قاصر تھے۔ اس لئے جب اُن کو اس مقررہ نظام کی اتباع کی دعوت دی گئی جس کا تعلق اسم رحمٰن سے ہے تو کہہ اُٹھے کہ رحمٰن کیا چیز ہے۔

واذا قیل لھم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن (سورہ الفرقان آیت سجدہ)	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو وجہ جہل کہتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے۔

وہ خدا کی مرضی و نامرضی کے متعلق اس باطل خیال میں مبتلا تھے کہ خدا نے دنیا میں جن بندوں کو خوش حالی عطا فرمائی ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ ان سے خوش ہے اب اُن پر غضب و عذاب نازل نہیں کیا جائیگا۔ رحمت و غضبِ خداوندی کا تعلق خدا کے بتائے ہوئے علم و عمل سے نہیں ہے بلکہ مال و اولاد سے ہے۔ مال و اولاد اگر خدا کسی کو عطا کرے تو یہی اللہ کا فضل و رحمت، اور نہ عطا کرے تو یہ غضب و عذاب ہے

قالوا نحن اکثر اموالاً و اولاداً و ما نحن بمعذبین۔ (السبا ع)	اور انہوں نے کہا کہ ہم مال و اولاد میں زیادہ ہیں۔ ہم کو کبھی عذاب نہ ہوگا۔

کثرتِ مال و اولاد ہی کو وہ خیر سمجھتے تھے۔ ان کے اسی خیال کو حق تعالیٰ نے سورۂ مؤمنون میں بیان فرمایا ہے۔

ایحسبون انّما نمدھم بہ من مال وبنین نسارع لھم فی الخیرات	کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو جو مال و اولاد دیتے چلے جاتے ہیں تو ہم اُن کو جلدی جلدی فائدے پہنچا رہے ہیں۔

وہ اس غلط پندار میں بھی مبتلا تھے کہ کوئی بالاتر ہستی اُن پر قادر نہیں ہے۔ جو اُن پر داروگیر کر سکے اور ان سے باز پرس کرے۔

ایحسب ان لن یقدر علیہ احد (البلد)	کیا وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ کسی کے قابو میں نہیں ہے

اور نیز یہ کہ کوئی ان کے اعمال کی نگرانی اور دیکھ بھال نہیں کر رہا ہے۔

ایحسب ان لم یرہ احد	کیا وہ خیال کرتا ہے کہ کوئی اس پر نگران نہیں ہے

مرنے کے بعد زندہ ہونے کے اور روزِ جزاء، قیامت کے بھی قائل نہیں تھے۔

زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا	(التغابن) کافر مدعی ہیں کہ وہ ہرگز دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے

اس چند روزہ زندگی کو وہ اصلی زندگی سمجھتے تھے اور اس عقیدہ میں اتنے پکّے تھے کہ ابدی حیاتِ آخرہ کے فطری اور حقیقی نظریۂ حیات کے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ ایسی بات کہنا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔

ان ھی الا حیاتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین ○ ان ھو الا رجل افتریٰ علی اللہ کذبا وما نحن لہ بمؤمنین۔ (المؤمنون)	بس زندگی تو یہی ہماری دنیا وی زندگی ہے کہ ہم میں کوئی مرتا ہے اور کوئی پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے بس یہ ایک ایسا شخص ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے ہم اس کو سچا نہ سمجھیں گے

وہ اس حقیقت کے بھی منکر تھے کہ انسان کو اللہ نے کسی خاص مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور اپنے اعمال کی جواب دہی کے لئے اس کو اللہ کے روبرو حاضر ہونا پڑے گا۔

افحسبتم انما خلقنٰکم عبثا وانکم الینا لا ترجعون۔	کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو یوں مہمل پیدا کر دیا اور یہ کہ تم ہمارے روبرو نہیں لائے جاؤ گے

ایک باطل عقیدہ یہ بھی تھا کہ وہ افرادِ خلق کو اذنِ الٰہی کے بغیر نافع وضار اور اشیاء کو مؤثر

سمجھتے تھے اور اس حقیقت کو نہیں مانتے تھے کہ نظامِ کائنات اور اشیاء کی حرکت اور تغیر و فعل و اثر ہر آن اللہ جل شانہ کے حکم کا تابع اور اذن کا محتاج ہے۔ قرآن مجید نے ان ہی باطل افکار و خیالات کی تردید فرمائی ہے۔ وجدان و مشاہدات کی روشنی میں مختلف مواقع پر مختلف انداز سے انسان کی فطری حیثیت کو نمایاں کرتے ہوئے اس کو حقیقت کی طرف متوجہ کیا تاکہ وہ باطل عقائد کو ترک کر کے دعوتِ حق کو قبول کرے۔ یہ تمام امور پیش نظر رکھنے سے ان قرآنی آیات کے مطالب سمجھ میں آسکتے ہیں۔ جن سے مسئلہ وحدت الوجود کا یہ جزو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ "خالق ہی مخلوقات کی صورت میں موجود و ظاہر ہے۔" اور صفات و وجود خلق و صفات و وجود حق ایک ہی ہے۔"

شاہ عبد العزیز رح محدث دہلوی فتاوی عزیزیہ جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں کہ "در آیات بسیار اشارات در ایں معنی واقع شدہ است، صریح ترین آیات "سنریھم اٰیٰتنا فی الآفاق وفی انفسھم الخ"

یہ سورہ حم السجدہ کی آیت ہے۔ اس کی ابتدا ہی میں یہ حقیقت بیان فرمائی گئی ہے کہ کلام مجید جو اللہ کے بندوں کے لئے ایک مکمل دستور بندگی ہے۔ وہ رحمٰن و رحیم نے نازل کیا ہے۔

تنزیل من الرحمٰن الرحیم	نازل کیا جاتا ہے ایک رحمٰن و رحیم کی طرف سے۔

علم و عمل اور جزائے علم و عمل کا تعلق الرحمٰن الرحیم ہی سے ہے اس لئے اس کی یہ صفت بیان فرمائی۔

بشیراً ونذیراً۔	(ماننے والوں کیلئے) بشارت دینے والا اور (نہ ماننے والوں کے لئے) ڈرانے والا۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنی علم و عمل قبول کرنے والوں کو یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ وہ عارضی و ابدی زندگی میں اللہ جل شانہ کی رحمتوں سے سرفراز کئے جائیں گے اور انکار کرنیوالوں

کو کفر کے عارضی و ابدی نتائج بد سے ڈرایا گیا ہے۔ چنانچہ دوسرے رکوع میں انکار حق کی وجہ سے قوم عاد و ثمود پر جو عذاب دنیا میں نازل کیا گیا اس کو بیان فرما کر یہ تاکید کر دی گئی کہ

ولعذاب الاٰخرۃ اخزیٰ وھم لا ینصرون۔	اور آخرت کا عذاب اور زیادہ رسوائی کا سبب ہے اور نہ اُن کا کوئی مددگار ہوگا۔

اس طرح قرآنی دعوت قبول کرنے والوں کو بشارت دی گئی۔

ابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیٰؤکم فی الحیٰوۃ الدنیا وفی الاٰخرۃ (ع ۴)	خوش ہو اس جنت پر جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے ہم تمہارے رفیق و دوست ہیں دنیا اور آخرت کی زندگی میں۔

اس سورہ میں قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور روز جزا و حیاتِ آخرہ کے واقع ہونے کے دلائل بیان فرمائے گئے ہیں اور انسان کی اس باطل ذہنیت کو بیان کیا گیا ہے کہ جزائے اعمال کا کوئی دن اللہ نے مقرر نہیں کیا جو اس زندگی میں خوش حال ہے۔ اس کے لئے آخرت میں بھی بہتری ہے۔

وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رجعت الیٰ ربی ان لی عندہ للحسنیٰ۔	اور میں نہیں خیال کرتا کہ قیامت قائم ہوگی اگر میں اپنے رب کے روبرو حاضر بھی کیا گیا تو میرے لئے رب کے پاس بھی بہتری ہے

آیۂ کریمہ " سنریھم اٰیٰتنا " سے پہلے منکرین آخرت سے دریافت فرمایا گیا ہے کہ اگر حقیقت یہی ہو کہ یہ قرآن اللہ جل شانہٗ نے نازل کیا ہے اور تم اس کا انکار کردو تو بتلاؤ کہ ایسے شخص سے زیادہ کون گمراہ اور حق کا مخالف ہوگا۔

قل ارأیتم ان کان من عند اللہ ثم کفرتم بہ من اضل ممن ھو فی شقاقٍ بعید ○	آپ کہیئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر یہ (قرآن) خدا کے یہاں سے آیا ہو اور پھر تم اس کا انکار کردو تو ایسے شخص سے زیادہ غلطی پر کون ہوگا جو (حق سے) ایسی دور دراز مخالفت میں پڑا ہو۔

اوپر کی آیتوں میں اللہ جل شانہٗ نے قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے اور قیامت کے برحق ہونے کا جب ذکر فرما دیا۔ اور گزشتہ اقوام عاد و ثمود کا حال بیان کر دیا۔ تاکہ قرآن مجید نے اہل ایمان کو جو بشارت دی ہے اور اہل کفر کو انکارِ حق کے عارضی و ابدی نتائج سے جو ڈرایا ہے اس پر غور کر کے منکرین حق دعوتِ حق قبول کر لیں مگر پھر وہ حق کا انکار ہی کرتے رہے تو اس کے بعد ان کو متنبہ فرمایا کہ " سنریھم اٰیٰتنا فی الاٰفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق " یعنی ہم عنقریب قرآن مجید، دعوت الی اللہ، حق ہونے کی نشانیاں دکھلا دیں گے۔ ان کی ذات میں بھی اور ان کے گرد و نواح میں بھی اس آیت میں مخاطبت منکرین حق سے ہے۔ "ھم" اور "لھم" کی ضمیریں منکرین حق کی طرف جا رہی ہیں۔ یہ سورت مکی ہے۔ مکہ کے واقعات پر غور فرمائیے کہ کفارِ مکہ کو قرآن مجید کے حق ہونے کی کتنی نشانیاں یکے بعد دیگرے دکھائی گئیں۔ انہوں نے حق کی آواز کو مٹانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر ان کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور ہر مرتبہ اُن کو ذلت و رسوائی اٹھانی پڑی۔ نورِ حق کا آفتاب جو افق مکہ پر طلوع ہو چکا تھا، بلند ہوتا ہی گیا۔ خود انکار و مخالفت کرنے والوں کی ذات میں سے ان کے بھائی بند ایک ایک کر کے حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو قتل کرنے کی سازش کئی مرتبہ کی گئی، مگر اس کا اثر اُلٹا ہی ہوا اپنے قبیلہ کی جس بڑی شخصیت سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کو انہوں نے اس ناپاک مقصد کے لئے منتخب کیا تھا، وہ اس مقصد کو پورا کرنے کا پختہ عزم کر کے گھر سے نکلتی ہے مگر حق تعالیٰ اپنی قدرت دکھلاتے ہیں، وہ آستانۂ نبوت پر پروانۂ شمع نبوت ہو کر حاضر ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس جاں نثار حق کی زبانِ حق ترجمان سے جب حرم کعبہ اور مکہ کی گھاٹیوں میں لا الٰہ الا اللہ کی صدائے اذان گونجی تو اپنی اس ناکامی و ذلت پر اپنا ہی خون پی کر رہ گئے۔ ابتداءً جن غریبوں نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا تھا

ان پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے گئے۔ مگر تائیدو نصرت حق سے ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ مخالفتِ حق کے لئے جو قدم اٹھاتے منہ کی کھاتے۔ اس کے بعد جنگ بدر و احد و حنین اور فتح مکہ کے واقعات ہیں۔ قلتِ تعداد و سامان کے باوجود اہل ایمان کو نصرت و کامرانی اور منکرین حق کو کثرتِ سامان و تعداد کے باوجود ذلت و ناکامی جو پیش آئی "یتبیّن لھم انہ الحق" کی شان ظاہر ہو کر رہی۔ آغاز دعوت کے ساتھ ہی حق و باطل کی آویزش اور اہل باطل کی پوری مخالفت کے باوجود اہلِ حق کا حلقہ وسیع اور قوی ہوتا گیا۔ یہی وہ نشانیاں تھیں جو انفس و آفاق میں منکرین قرآن مجید کو دکھائی گئیں۔ سیاق و سباق اور واقعات کے لحاظ سے آیۂ کریمہ "سنریھم اٰیتنا" الخ کا یہی واضح اور صریح مطلب ہے۔ اس سے صرف نظر کر کے آیت سے یہ ثابت کرنا کہ "حق تعالیٰ ہی انسان کی صورت میں اور تمام مخلوق کی صورت میں موجود و ظاہر ہے" کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ "منکرینِ حق سے حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تم دعوت کا انکار کرو عنقریب تم پر یہ راز ظاہر کر دیا جائے گا کہ اللہ ہی تمہاری صورت میں اور تمام مخلوق کی صورت میں موجود و ظاہر ہے۔ اور اس طرح تم کو قرب کا علم دے کر مقرب بنا دیا جائے گا۔" اگر اس کلام الٰہی سے یہی مراد الٰہی ہے تو سہ ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے۔

کیا واقعات سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کفار و مشرکین جو اس آیت کے مخاطب ہیں اُن کو یہ بات دکھا دی گئی تھی کہ اللہ ہی ہر صورت میں موجود و ظاہر ہے؟ یقیناً اشارتاً بھی واقعات سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ تو کیا پھر نعوذ باللہ حق تعالیٰ کا ارشاد "سنریھم اٰیتنا" مخاطبین کے حق میں غلط ثابت ہوا؟ کلام الٰہی کی ایسی تعبیر سیاق و سباق، واقعات اور مخاطبین آیت کے افکار و خیالات پر نظر کرتے کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی نیز اس آیت میں لفظ "آیات" استعمال فرمایا گیا ہے جس کے

معنی حکم ونشان ہیں نہ کہ ذات وصفات ۔ آیت کے آخری جزو "الا انھم فی مریۃ" الخ کا مطلب آیت معیت کے سلسلہ میں عرض کیا جاتا ہے ۔

دوسری آیت "ھو معکم این ما کنتم" (وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں ہو) اس آیت کے بعد ہی ارشاد ہے "واللہ بما تعملون بصیر" (اور اللہ تمہارے سب اعمال کو دیکھتا ہے) قبل ازیں بیان کر دیا گیا ہے کہ منکرین حق سمجھتے تھے کوئی اُن کے اعمال کی دیکھ بھال نہیں کر رہا ہے ۔ اور کوئی قوت اُن پر نگران نہیں ہے ۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اللہ جل شانہٗ کو ان کے اکثر اعمال کی خبر نہیں ہوتی چنانچہ سورہ حٰم السجدہ میں منکرین حق کی اس باطل ذہنیت کو بیان کیا گیا ہے ۔

ولکن ظننتم ان اللہ لا یعلم کثیرا مما تعملون (۲۲)	اور لیکن تم اس گمان میں تھے اللہ کو تمہارے بہت سے اعمال کی خبر نہیں ہے ۔

اور اس کے بعد ہی ان سے فرمایا جاتا ہے کہ تمہارا یہی باطل خیال تمہاری بربادی کا سبب ہوا

وذلکم ظنکم الذی ظننتم بربکم اردٰکم فاصبحتم من الخٰسرین	اور تمہارے اس گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو ہلاک کیا پھر تم خسارے میں پڑ گئے ۔

انسان کو اس کے باطل افکار ، ناشائستہ حرکات ، مفسدانہ اعمال سے باز رہنے کا اس سے بہتر اور مؤثر طریقہ کیا ہو سکتا ہے کہ انسانوں پر اس حقیقت کو ظاہر کر دیا جائے کہ تم خلوت میں رہو یا جلوت میں اللہ ہر جگہ تمہارے ساتھ اور تمہارے اعمال سے باخبر ہے چنانچہ سورۂ مجادلہ میں بصراحت اس مطلب کو بیان فرمایا گیا ہے ۔ آیت اگرچہ بڑی ہے مگر اللہ جل شانہٗ نے اپنی معیت کا جو علم دیا ہے ۔ اس کا ایک مطلب ومنشاء واضح طور پر سمجھنے کے لئے اس آیت کو لکھ دیتا ہوں ۔

الم تر ان اللہ یعلم ما فی السمٰوات	کیا آپ نے نظر نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ

وما فی الارض ما یکون من نجوٰی ثلٰثۃٍ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنٰی من ذٰلک ولا اکثر الا ھو معھم این ما کانوا ج ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیٰمۃ ۵

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ (اللہ) نہ ہو اور نہ پانچ کی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم اور زیادہ، مگر وہ (اللہ) ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ لوگ کہیں بھی ہوں پھر وہ قیامت کے دن ان کے کئے کام بتلا دے گا۔

اپنی معیت سے آگاہ کرنے کا مطلب یہی ہے کہ انسان پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ اللہ جل شانہٗ انسان کے تمام پوشیدہ باتوں سے باخبر رہتے ہیں۔ اور کوئی بات اللہ سے چھپی ہوئی نہیں رہتی۔ آیت کا آغاز بھی اسی حقیقت کے اظہار سے ہوا ہے۔ کیا آپ نے نظر نہیں فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔ سورۃ النسأ میں کفار و مشرکین کو اس بات پر متنبہ فرمایا گیا ہے کہ لوگوں سے چھپاتے ہو، شرماتے ہو، مگر اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ اس وقت بھی ان کے ساتھ ہے جبکہ وہ چھپ کر سازشیں کرتے رہتے ہیں۔

یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ وھو معھم اذ یبیتون ما لا یرضٰی من القول۔ (ع ۱۶)

آدمیوں سے چھپاتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ اس وقت ان کے پاس ہے جبکہ وہ خلاف مرضی الٰہی گفتگو کے متعلق تدبیریں کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ فرمایا جاتا ہے۔

وکان اللہ بما یعملون محیطا۔

اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہے

جاہل انسانوں کا یہ باطل خیال کہ کوئی بالاتر ہستی اُن پر نگران نہیں ہے۔ اور ان کے اعمال و حرکات کی دیکھ بھال کوئی نہیں کر رہا ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے اپنی معیت کا علم عطا فرما کر اس باطل خیال کی تردید فرما دی اور متنبہ کر دیا کہ اللہ سے کوئی بات چھپی ڈھکی نہیں ہے۔ اور

انسان کے تمام اعمال کو اللہ تعالیٰ محفوظ کر لیتے ہیں۔ جو بروز قیامت جزائے اعمال کے دن انسان کو دکھلائے جائیں گے۔ اور ہر عمل کا بدل انسان پاکر رہیگا۔

احاطت ۔ سورہ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں یہ فرمایا کہ اللہ انسان کے تمام اعمال کو محیط ہے۔ اور سورہ "حم السجدہ" کی آیت "سنریھم ایٰتنا" کے آخری جزو میں ارشاد ہے کہ اللہ ہر شئی کو محیط ہے۔

الا انھم فی مریۃٍ من لقاء ربھم ۗ الا انہ بکل شیٍٔ محیط ۔	یاد رکھو کہ وہ لوگ اپنے رب کے روبرو جانے سے شک میں پڑے ہیں یاد رکھو وہ ہر چیز کو احاطے میں لئے ہوئے ہیں۔

لقاء رب کا لفظ قرآن مجید میں عموماً ان معنوں میں آیا ہے کہ قیامت کے روز آدمی کو خدا کے روبرو حاضر ہونا اور خدا کو منہ دکھانا ہوگا۔ کفار و مشرکین اسی کی تکذیب کرتے تھے۔ اور اس کے واقع ہونے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور پرسشِ اعمال کے بعد اعمال کی جزاء پانے کا انکار کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ جل شانہٗ نے متعدد مقامات پر حیات بعد الموت کے متعلق ایسے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ جن کو فطرتِ سلیمہ بآسانی قبول کر سکتی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تقریباً پورا قرآن مجید توحید اور حیاتِ آخرہ ہی کے دلائل سے بھرا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے حیاتِ آخرہ کے جو مصداقات فطرتِ انسانی میں رکھے ہیں وہ بجائے خود حیاتِ آخرہ کا ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ اور اسی کو مختلف پیرایۂ بیان سے واضح فرمایا گیا ہے۔ تمام دلائل کے منجملہ ایک دلیل آیۂ کریمہ "انہ بکل شیٍٔ محیط" ہے جس سے یہ ثابت کیا جارہا ہے۔ کہ قیامت کا واقع ہونا برحق ہے اور تمام انسانوں کا خدا کے روبرو اعمال کی جوابدہی اور اعمال کی جزاء پانے کے لئے حاضر ہونا اللہ جل شانہٗ کا ایک اٹل و قطعی حکم ہے۔ کیونکہ منکرینِ روزِ جزاء اور اس کے متعلق شک میں رہنے والے ہی اس آیت کے مخاطب ہیں۔ اس واضح و صریح مطلب کو نظر انداز کر کے "محیط" کا مطلب "تمثل" بیان کرنا، یہ ثابت کرنا کہ حق ہی بصورت خلق موجود ہے اور مثالاً یہ کہنا کہ

جیسے لکڑی میز یا کرسی کو محیط ہے۔ غور فرمائیے کیا صحیح قرآن فہمی ہے لغت و محاورہ میں احاطت کے معنی ہیں نگہبانی و نگرانی کرنا، گھیر لینا۔ ہر چیز سے باخبر ہونا۔ قرآن مجید میں حق سبحانہ تعالیٰ نے اسم محیط سے اپنی یہی صفت و قدرت بیان فرمائی ہے۔ کہ اللہ کی ذات اعلیٰ و عظیم ہر شئی کی نگہبان و نگران ہے۔ ہر شئے سے باخبر ہے اور ہر شئی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کے مقررہ نظام میں ایسی بندھی ہوئی ہے کہ اپنے اپنے مواقع پر ہر چیز ظاہر ہو کر رہیگی حیاتِ انسانی کے جتنے مراحل و منازل مقرر کر دیئے گئے ہیں انسان کا ہر منزل ہر مرحلہ پر گزرنا اور وہاں کے مقررہ حالات سے دوچار ہونا قدرت سے بندھے ہوئے نظام کا ایک جزوِ لاینفک ہے۔ اس حقیقت پر جب انسان یقین کر لیتا ہے اور اس تمام تفصیل کے ساتھ یقین کر لیتا ہے جو کتاب و سنت میں بطور تاکید بیان فرمائی گئی ہے۔ تو اُس کے افکار میں، جذبات میں، مقاصد میں، غرض اس کی پوری زندگی میں انقلاب واقع ہو جاتا ہے اور اس کے عزائم و ارادوں میں ایک طرف جولانی پیدا ہو جاتی ہے تو ایک طرف خوف و خشیت الٰہی اس پر طاری رہتا ہے جس کے بعد مخلوق سے نڈر ہو کر راہِ حق پر گامزن ہونا اُس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کا انکار حق سے سرکشی، طغیان، انحراف و اعراض کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس لیئے قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف انسان کو متوجہ کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور زیادہ تر استدلال میں اپنی اس قدرت کاملہ کو بیان فرمایا جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے۔ اور ایک مختصر آیۂ کریمہ "بیدہٖ ملکوت کل شیئً" میں جس کی تمام تفصیل مندرج ہے سورۂ یٰسین میں انسان کے جھگڑالو پن

قال من یحی العظام وھی رمیم۔	کہتا ہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہو جانیکے بعد کون زندہ کریگا۔

کو بیان کر کے اس کا یہ جواب دیتے ہوئے۔

قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃٍ	جواب دیجیے کہ وہی زندہ کریگا جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا۔

اپنی قدرت کاملہ بیان فرمائی۔

فسبحٰن الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٍٔ والیہِ ترجعون ٥	پس پاک ہے اسکی ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔

یہی قدرت کاملہ اسمِ محیط کی شان ہے نیز احاطہ کے معنی کسی شئے سے باخبر ہونا خود قرآن مجید سے ثابت ہے سورہ "الکھف" میں "ذی القرنین" کے متعلق حق تعالیٰ فرما رہے ہیں۔

وقد احطنا بما لدیہ خبرًا	اور اسکے پاس جو کچھ ساما ن و اسباب تھا ہمکو اسکی پوری خبر ہے

اسی طرح سورہ "النمل" میں "الھدھد" پرند نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملکۂ سبا اور ملک سبا کی جو اطلاع دی ہے۔ اس موقع پر بھی یہی لفظ احاطہ استعمال کیا گیا ہے۔

فقال احطت بما لم تحط بہ	کہنے لگا کہ میں ایسی بات معلوم کرکے آیا ہوں جو آپکو معلوم نہیں

حق تعالیٰ ہر شئی کو جانتے ہیں۔ ہر شئی ان کے احاطۂ علم میں ہے۔ ہر شئے پر ان کو کامل قدرت واختیار ہے آیۂ کریمہ "انہٗ بکل شئی محیط" کا بھی یہی مطلب ہے۔

آیت ۳ "نحن اقرب الیہ من حبل الورید" (ہم انسان کی رگ گردن سے زیادہ قریب ہیں) یہ آیت سورہ "ق" کی ہے اس آیت سے پہلے رسالت کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے۔

کل کذب الرسل۔	سب نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

رسالت کے پیغام کا ایک اہم اور بنیادی جزو موت کے بعد کی ابدی زندگی اور اس کی تفصیل ہے۔ اس حقیقی زندگی کا واقع ہونا جن کی سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ دعوتِ توحید، پیغامِ رسالت یعنی اللہ جل شانہ کے الٰہ واحد ہونے کا بھی انکار کردیتے تھے چنانچہ اس سلسلہ میں حیات بعد الموت کے متعلق تکذیب کرنے والوں کے شک و شبہ کو بیان فرمایا ہے۔

بل ھم فی لبس من خلقٍ جدید	بلکہ یہ لوگ ازسرِنو پیدا کرنے کی طرف سے شبہ میں ہیں

موت کے بعد دوبارہ پیدا ہونے کا انکار کرنے یا اس کی طرف سے شک شبہ میں رہنے کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ خدائے علیم وحکیم نے انسان کو عبث اور یوں ہی بلا کسی مقصد کے

پیدا کیا ہے۔ اور انسان سے اُس کے اعمال کی کوئی پرسش نہیں کی جائے گی۔

کیا انسان خیال کرتا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا۔	ایحسب الانسان ان یترك سدًی ۝ (القیٰمۃ)

انسان کے اس باطل خیال کو غلط ثابت کرنے کے لئے حق تعالیٰ آیت ونحن اقرب الیہ سے پہلے اپنے قدرتی نظام کو بیان فرماتے ہیں۔

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں اُن کو جانتے ہیں	ولقد خلقنا الانسان ونعلم ماتوسوس بہ نفسہ ۔ (ق)

یعنی عمل کرنے سے پہلے جو خیال محرک عمل ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اُس کو بھی جانتے ہیں کیونکہ اس کی رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ اس کے بعد ہی انسان کا نامۂ اعمال لکھنے کا جو الٰہی نظام ہے اُس کو بیان فرما دیا۔

جب وہ اخذ کرنے والے فرشتے اخذ کرتے رہتے ہیں جو دائیں بائیں مقرر ہیں۔	اذ یتلقی المتلقیٰن عن الیمین وعن الشمال قعید ۝

اس کے بعد موت کی سختی اور روزِ قیامت کے واقع ہونے کا بیان ہے۔ ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے جو مطلب واضح ہوتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ انسان کو پیدا کرنا اور اس کے افکار و خیالات سے باخبر ہونے کے لئے اس حقیقت کو بیان کرنا کہ ہم رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ یعنی اس کے باطنی احوال سے باخبر ہیں اور انسان کے اعمال پر نگرانی اور اُس کو ضبطِ تحریر میں رکھنے کا جو نظام ہے اسے بیان فرمانا اسی مقصد کے لئے ہے کہ جاہل انسان کو یہ سمجھایا جائے کہ یہ تمام مذکورہ اٹل، مقررہ نظام اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی پیدائش عبث اور بے نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس عارضی زندگی کے بعد ایک ابدی زندگی کا دور شروع ہوگا۔ جو لازوال و غیر فانی ہے اور وہی زندگی ہے جس میں انسان اپنے بھلے بُرے اعمال کی جزا پائے گا۔ اس غرض کے لئے دنیا میں اس کے

افکار و خیالات و اعمال پر کڑی نگرانی اور دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس صورت میں حق تعالیٰ نے نحن اقرب الیہ بیان فرما کر سورۂ واقعہ میں یہ واضح فرما دیا کہ اقرب ہونے کی کیا کیفیت ہے۔ اس کو ادراک کرنے سے انسان کی بصر و بصیرت عاجز ہے۔

ونحن اقرب الیہ منکم ولکن لاتبصرون۔ (واقعہ ع ۳)	اور ہم اُس شخص کے نزدیک ہوتے ہیں تم سے بھی زیادہ لیکن تم نہیں سمجھتے۔

چوتھی آیت۔

ھوالاوّل والآخر والظاھر والباطن	وہی اوّل ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے

یہ سورۃ الحدید کی آیت ہے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنے چار اسماءِ حسنیٰ الاوّل، الآخر، الظاہر، الباطن کو توحید کے دلائل میں بیان فرمایا ہے۔ توحید ہی سے نسبتِ عبدیت صحیح ہو جاتی ہے۔ توحید کے قرآنی مفہوم کا خلاصہ یہ ہے کہ حیات و ممات، فنا و بقاء کا یہ جو ایک ناقابل تغیّر نظام کائنات انسان کی زندگی کو گھیرے ہوئے ہے، بلا شرکت غیرے اللہ جل شانہٗ ہی اِس کے فرماں روا ہیں۔ عارضی و ابدی نفع و ضرر، منع و عطا، حیات و موت، رزق و عافیت، ذلت و عزت، اللہ ہی کے اختیار میں ہے چنانچہ اس آیت سے پہلے کی آیتوں میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لہ ملک السمٰوٰت والارض یحیی و یمیت ج وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر	اس کی بادشاہی ہے آسمانوں اور زمین میں وہی حیات دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے وہی ہر چیز پر قادر ہے

یعنی پورا نظامِ کائنات اسی کے حکم و قدرت سے جاری و ساری ہے اس کے بعد ارشاد ہے "وھوالاوّل" وہی اوّل ہے۔ ہر شئ کا ظہور اور ہر کام کی ابتداء اسی کے حکم سے ہے پہلے اسی کی توجہ و ارادہ اور حکم ہے بعد شئ کی حرکت، فعل و اثر کا ظہور ہے۔ اس لئے بلحاظ حکم وہی اوّل ہے۔ ہر شئ کو پیدا کرنے کا جو مقصد ہے۔ وہی اس شئے کا انجام اور اس کی انتہا ہے۔ ہر شئ کا آخری انجام بھی اسی کے حکم و قدرت سے ہے۔ اس لئے وہی آخر

ہے ۔ اپنے آثار و احکام قدرت کے لحاظ سے وہی ظاہر ہے ۔ ہر شئی اسکے حکم کے تابع ہے ۔ وہی ہر شئی پر فوق و غالب ہے ۔ اپنے آثار و احکام و قدرت سے ظاہر و فوق و غالب ہونے کے باوجود سب سے پوشیدہ "الباطن" ہے کوئی شے اُس سے زیادہ پوشیدہ نہیں ہے ہر غیر مرئی شئے اس عالم میں کسی نہ کسی صورت سے مرئی ہو سکتی ہے ۔ مگر وہ اتنا پوشیدہ ہے کہ بصر و بصیرت اس کی یافت و ادراک سے عاجز ہیں ۔ یہ آیت "وھو بکل شئی علیم" پر ختم ہوتی ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر شئی کے ظہور سے پہلے شئے کو جانتا ہے اور شے کے انجام سے پہلے اس کے انجام کو جانتا ہے وہی ہر شئے کے ظاہر کو جانتا ہے ۔ اور اس کے باطن کو بھی جانتا ہے ۔ کوئی شئے اس کے دائرہ علم سے خارج نہیں ہے ۔ اسی لئے ہر شئے اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ اُس کے حکم و ارادہ کے بغیر نہ کوئی نفع و خیر حاصل ہو سکتا ہے اور نہ ضرر پہنچ سکتا ہے ۔ حق تعالیٰ سے نسبت عبدیت قوی اور مستحکم رکھنے کے لئے اور شرور و آفات میں حق تعالیٰ ہی کیطرف متوجہ رہنے کے لئے توحید کی حقیقت اس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شرور و آفات سے محفوظ رہنے اور افراد خلق میں کسی کا محتاج نہ رہنے کی دعا میں ان اسماء حسنیٰ کی تلاوت ان کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے ۔

عن ابی ھریرۃؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ کان یقول اذا اوی الی فراشہ اللھم رب السمٰوٰت ورب الارض ورب کل شئ فالق الحب والنوی منزل التوراۃ والانجیل والقراٰن اعوذ بک من شر کل ذی شر انت اٰخذ بناصیتہ انت الاول فلیس قبلک شئ وانت الاٰخر فلیس

روایت کی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ آپ فرماتے تھے جب لیٹنا چاہتے اپنے بچھونے پر اے اللہ پروردگار آسمانوں کے اور زمین اور ہر چیز کے ، چیرنے والے دانے کے اور خرما کی گٹھلی کے ، نازل کرنے والے توراۃ و انجیل اور قرآن کے میں تیری پناہ چاہتا ہوں ہر شر والے کے شر سے تو ہی سب سے اول ہے نہیں ہے تیرے پہلے کوئی چیز ، تو ہی سب سے آخر ہے تیرے بعد کوئی چیز نہیں ۔ تو ہی ظاہر ہے

بعدک شیٔ وانت الظاھر فلیس فوقک شیٔ وانت الباطن فلیس دونک شیٔ اقض عنی الدین واغننی من الفقر (رواہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، مسلم)	نہیں ہے تجھ پر فوق کوئی چیز، اور تو ہی پوشیدہ ہے نہیں ہے تجھ سے زیادہ چھپی ہوئی کوئی چیز اور کہ میرا قرض ادا اور غنی کر مجھ کو محتاجی سے

روحی فداہٗ دعا کیا ہے، عبدیت، بندگی کے صحیح احساسات اور توحید کی صحیح دانش کا کتنا بہتر نقشہ ہے۔

اس حدیث کے اوّل و آخر کو چھوڑ کر صرف "انت الاول لیس قبلک شیٔ" سے لیس دونک شیٔ" تک بیان کر کے مخلوق میں خالق کے اصلی صفات و وجود ثابت کرنے کی جو کوشش فرمائی گئی ہے۔ سنجیدہ دماغ حضرات کے لئے قابلِ غور ہے کہ کس حد تک وہ درست ہے۔ قرآنی آیت "ھوالاوّل" کی پہلی دو آیتیں "لہ ملک السمٰوٰت" "وھو بکل شیٔ قدیر" اور آیت کا آخری حصّہ "وھو بکل شیٔ علیم" سے یہی حقیقت ثابت ہے کہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو اللہ جل شانہٗ کا علم وقدرت وحکم گھیرے ہوئے ہے اور کوئی شیٔ ان کے احاطہ علم وقدرت وحکم سے باہر نہیں ہے

اوپر کی چار آیتوں میں انسان جاہل و نادان انسان، دینِ فطرت اور خالقِ فطرت کو بھولے ہوئے انسان کو اس کا یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا گیا ہے کہ وہ بندہ ہے اُس اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا بندہ ہے۔ جس کے احکام کی بندشوں میں انسان کی پوری زندگی اور تمام نظامِ کائنات جکڑا ہوا ہے۔ اسی کے اِذن وارادہ کا تابع اور محتاج ہے احتیاج و بندگی کا یہ فطری تعلق موت کے بعد ختم نہیں ہو جاتا ہے۔ بندوں کا اپنے مالک وحاکم حقیقی کے روبرو ایک روز حاضر ہونا ایک واقعہ نفس الامری ہے۔ یہ ایک امر قطعی ہے کہ اللہ کے نورِ ہدایت سے اپنی شمعِ حیات کو روشن رکھنے والے بندوں کو سرور وراحت کی ابدی زندگی اور جہل کی تاریکیوں میں سفرِ حیات طے کرنے والوں کو درد واذیت کی ابدی

زندگی عطا کی جائیگی۔ عقل کا اندھا پن اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ خدا کے قوانینِ قدرت کا پابند و تابع ہونے کے باوجود اپنی بندگی اور خدا کی حکومت و فرماں روائی و ربوبیت کا منکر ہے۔ حیاتِ ابدی کا فطری مطالبہ رکھ کر ابدی زندگی، حیاتِ بعد الموت کا انکار کرتا ہے۔ مکافاتِ عمل کا جو قدرتی نظام دنیا میں جاری و ساری ہے اس کو تجربہ و مشاہدہ میں رکھ کر بھی ابدی جزائے اعمال کے قانونِ قدرت کو تسلیم نہیں کرتا جن آیتوں میں انسان کو فطرت شناسی و عاقبت بینی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان سے بلحاظ وجود و صفات خلق و حق کو ایک ثابت کرنے والوں کی خدمت میں عرض ہے ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

آج ترقی یافتہ دنیا، روشن خیال دنیا، مدعیِ عقل و دانش دنیا غور کیجئے ان ہی تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے۔ خدا کی فرماں روائی کا انکار ہے۔ اپنی بندگی و انجامِ آخرت کا انکار ہے۔ ظلمت ہی ظلمت ہے۔ اپنی فطرت کو بھولی ہوئی ہے۔ فطرت کے حقیقی مطالبات کو بھولی ہوئی ہے۔ سفرِ حیات کی آخری منزل کو بھولی ہوئی ہے۔ انسانیت کو بھولی ہوئی ہے۔ صرف حیوانیت اور نری حیوانیت ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے حق میں، اور ایک قوم دوسری قوم کے حق میں درندہ بنی ہوئی ہے چھوٹے ہوں کہ بڑے، صرف فتنہ فساد کی تدبیروں میں رات دن مصروف، اور اس کا نام تدبیر و سیاست، دل و دماغ کو سکون ہے نہ راحت، اپنے پیدا کرنے والے سے، اپنے پالنہار سے منحرف ہونے کی یہ ایک ادنٰی اسزا، آخرت کے ابدی انجام بد کا پیش خیمہ ہے۔ دورِ جدید کے ائمہ فکر، دنیا کے پرستار اور آخرت سے غافل انسانوں کو "دعوتِ فکر و نظر"

پانچویں آیت "واذا سألك عبادی عنی فانی قریب" (اور میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کرتے ہیں (آپ کہہ دیجئے کہ) میں قریب ہوں) اس آیت کے مخاطب وہ اہل ایمان

اہل حق ہیں جنہوں نے اللہ جل شانہٗ سے بندگی و احتیاج کی نسبت قائم کر لی اس حقیقت کو بلا شک و شبہ تسلیم کر لیا کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا کوئی حاجت روا نہیں ہے وہی اپنے فضل و رحمت سے بندوں کی ہر حاجت پوری کر رہا ہے۔ ان حضرات نے دریافت کیا تھا کہ ہمارا حاجت روا ہم سے دور ہے یا قریب، قریب ہو تو آہستہ، دور ہو تو پکار کر دعا انکا کریں۔ اس سوال کے جواب میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ تمہارا حاجت روا، تمہاری دعاؤں کو سننے والا تم سے قریب ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہی ارشاد ہے کہ جب کوئی اس سے دعا کرتا ہے۔ وہ اس کی دعا کو سنتا ہے۔ پس چاہیئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ ہدایت پائیں۔

اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوالی و لیؤمنوابی لعلھم یرشدون ٥

منظور کرتا ہوں ہر عرضی درخواست کرنیوالے کی جبکہ وہ میرے حضور میں درخواست کرے سو ان کو چاہیئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ رشد و فلاح پائیں

ایک محتاج و فقیر کے لئے اس سے بڑھ کر تسکین و جمعیت خاطر کا اور کیا سامان ہوگا کہ اس کی حاجت روائی کرنے والا رب اعلیٰ و عظیم اس کے نزدیک ہے۔ اس کے پاس ہی ہے اس پر یقین رکھنے کا یہی اثر ہوگا کہ بندہ اپنی ہر حاجت اور ہر ضرورت اللہ ہی سے عرض کرے گا۔ ہر مشکل اور ہر تکلیف و مصیبت اللہ جل شانہٗ ہی کے سامنے پیش کی جائے گی اس عمل سے جو طمانیتِ قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اور قلب میں مخلوق سے جو استغنائی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اللہ سے ربط و تعلق میں جو اضافہ ہوتا جاتا ہے، وہی دراصل روح عبادت ہے۔ اور یہی مرضیٔ حق ہے کہ ان کا بھکاری ہر وقت ان ہی کے در پر پڑا رہے اور اپنی تمام آرزوؤں، مرادوں اور حاجتوں کا ملجا و ماوی صرف حق تعالیٰ ہی کو بنائے رکھے۔ اور اپنی ہر حاجت اور تکلیف کو ان ہی سے اولاً عرض کرے۔ کیا فضل و احسان ہے کہ اپنے فقیر و حاجت مند کی حاجت روائی کے لئے خود ہی اس کے پاس تشریف فرما ہیں اور فرماتے ہیں کہ مانگ مجھ سے جو مانگنا چاہتا ہے۔ اور کیا غفلت ہے

کہ بندہ حل مشکلات اور رفع حاجات و دفع مصائب کے لئے سب سے پہلے اپنے رب "سمیع وقریب" کی طرف رجوع نہ کرکے اسباب کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے حالانکہ اپنے قریب ہونے کا علم اسی لئے عطا فرمایا کہ بندہ اسباب کی طرف توجہ کرنے سے پہلے حقیقی مسبب وحاجت روا کی طرف رجوع کرے اور اس کے بعد تحت احکام اسبابِ اختیاری کو کام میں لائے۔ آیۂ کریمہ کا یہی وہ مطلب ہے جس کو پیشِ نظر رکھنے سے "لعلھم یرشدون" (تاکہ وہ رشد وہدایت حاصل کریں) کا مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ دعا دراصل استعانت، اپنے زندگی کے کاروبار میں اللہ ہی سے مدد مانگنے کا ایک مؤثر طریقہ ہے دعا کو سننے اور قبول کرنے والا جب قریب ہو تو بندہ سرتاپا دعا بن جاتا ہے۔ فطری عمل ہے کہ حاجت روا قریب، رگ جان سے زیادہ قریب ہونے کا یقین ہوجائے تو سب سے پہلے اس کی طرف توجہ کی جائے گی۔ عبد اپنے رب سے جب یہ فطری تعلق قائم کرلیتا ہے تو پھر بندہ دامنِ رحمت سے وابستہ کرلیا جاتا ہے اور آغوشِ رحمت میں اس کی پرورش فرمائی جاتی ہے اور وہ حلاوتِ ایمانی عطا کی جاتی ہے۔ جو اللہ جل شانہٗ کی ربوبیت پر ایمان لانے کا خاصّہ ہے۔

چھٹی آیت "واللّٰہ معکم" (اللہ تمہارے ساتھ ہے) اس آیت میں بھی مخاطبت اہل ایمان سے ہے۔ بگڑے ہوئے ماحول میں جب دعوتِ حق کو قبول کیا جاتا ہے تو دعوت قبول کرنے والے اہل حق کو ہمہ قسم کی مشکلات پیش آتی ہیں۔ کیونکہ اہل باطل، عام ازیں کہ کنبہ، برادری کے لوگ ہوں یا قوم کے دیگر افراد اہل حق کے مخالف ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ اہل حق معاشی تکالیف میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔ بلکہ اہل باطل کے ساتھ جدال وقتال کے مواقع بھی پیش آتے ہیں ایسے تمام مواقع پر اہل حق کو یقین دلایا گیا کہ اللہ تمہارے ساتھ ہیں، تمہارے حامی وناصر ہیں مشکلات ومصائب کا سامنا ہو کہ دشمنوں سے مقابلہ ہو اللہ ہر طرح تمہاری مدد کریں گے، کمزور، نہتے، بے سروسامان، مخالف ماحول میں رہنے والے

اللہ کے بندوں کو اس ایمان و آگہی سے زیادہ اور کس بات سے ڈھارس اور تقویت ہو سکتی ہے کہ ان کا رب اعلیٰ و عظیم، قادر و قوی، ہر شئے جس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اسباب کو بنانا اور بگاڑنا جس کے اختیار میں ہے۔ جو آن واحد میں جس کو چاہے فنا و ہلاک کر سکتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ہے، ان کا ناصر و مددگار ہے، ان کا محافظ و نگہبان ہے۔ یہاں معیّت، ساتھ ہونے کا یہی مطلب ہے۔

یہ آیت سورہ "محمد" کی ہے۔ اور دشمنوں سے مقابلہ کے موقعہ پر یہ ارشاد ہوا ہے

وانتم الاعلون والله معكم (۴۶)	اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

اہل ایمان کو اپنی معیّت کا علم عطا کرنے سے یہ بھی ایک مراد الٰہی ہے کہ اہل ایمان ہمیشہ اللہ جل شانہٗ کی معیّت کا یقین رکھ کر اپنے دل کو مضبوط رکھیں، باطل کی طاقت، قوت، کثرت و شوکت سے مرعوب نہ ہوں اور نہ اہل باطل کے مکر و فن سے حزن و تردد میں مبتلا ہوں اور ہجوم مصائب و مشکلات میں حیران و پریشان نہ ہوں۔ گو ظاہری اسباب کتنے ہی مایوس کن ہوں حقیقت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ہونے کا یقین جوہری توانائی سے کہیں زیادہ توانائی عطا کرتا ہے۔ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ اہلِ حق نے اسی قوتِ یقین کی بدولت باطل کے سیلاب کا مقابلہ کوہ آہن کی طرح کیا اور اللہ جل شانہٗ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کا ساتھ دیا حالانکہ اہل ایمان کے پاس ہمیشہ تعداد اور سامان کی کمی رہی حق تعالیٰ کی معیّت کا یقین ہی بندۂ مومن کو مردِ مجاہد اور صاحبِ عزیمت بنا دیتا ہے۔ لکھنے کی ضرورت نہیں قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والے جانتے ہیں کہ مصائب و مشکلات اور جدال و قتال کے ہر موقع پر حق تعالیٰ نے اپنی معیّت کا علم عطا فرما کر اہل ایمان کے قلوب میں ہمت اور قوت پیدا کی اور ہر وقت ثابت قدم رکھا۔ خوف و حزن کے دو قرآنی واقعات لکھتا ہوں تاکہ ایسے مواقع پر معیّت کا علم عطا کرنے سے جو مراد الٰہی ہے۔ اس کی مزید وضاحت ہو جائے۔

ہجرت کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سیدنا صدیق رضی اللہ عنہٗ غار ثور

میں تشریف فرما ہیں۔ سیدنا صدیق رضی اللہ عنہ کو اندیشہ ہوتا ہے کہیں دشمنوں کو ہمارا پتہ نہ لگ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لاتحزن ان اللہ معنا (التوبہ)	فکر مت کر اللہ ہمارے ساتھ ہے

اس کے بعد حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ ہم نے ان کو طمانیت خاطر عطا کی اور ان کی حفاظت فرمائی۔

فانزل اللہ سکینتہٗ علیہ۔	پس اللہ نے ان پر تسکین وتسلی نازل فرمائی۔

تبلیغ حق کیلئے حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوتا ہے یہ حضرات فرماتے ہیں۔

قالا ربنا اننا نخاف ان یفرط علینا او ان یطغیٰ ٥ (طٰہٰ)	دونوں نے عرض کیا اے ہمارے رب ہم ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کرے یا شرارت نہ کرے۔

حق تعالیٰ تسلی و اطمینان دلاتے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں فرعون کے کید ومکر اور شرارت سے تمہاری حفاظت کروں گا۔

قال لا تخافا اننی معکما اسمع واریٰ ٥	(اللہ نے) کہا مت ڈرو میں تمہارے ساتھ ہوں سب سنتا دیکھتا ہوں۔

ان دونوں واقعات میں دشمنوں سے خوف پیدا ہوا تھا اگر معیت کے معنی یہی ہیں کہ "ہر صورت میں اللہ ہی موجود وظاہر ہے" تو خوف وحزن پیدا ہونے کے لئے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے کہ تم دشمنوں سے کیوں ڈرتے ہو ان دشمنوں کے ساتھ بھی اللہ ہی ہیں یعنی دشمنوں کی صورت میں بھی اللہ ہی موجود وظاہر ہیں۔ اسی لئے ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے برخلاف یہ فرمارہے ہیں۔ اللہ تمہارے ساتھ ہیں۔ انسان چونکہ فطرتاً کمزور واقع ہوا ہے۔ اس لئے ایسے مواقع پر وہ فطرتاً کسی قوی کا ساتھ اور اس کی مدد چاہتا ہے اسی لئے اپنی معیت کا علم ویقین عطا فرما کر دلوں کو قوت بخشی جاتی ہے۔ معیت ہی کے علم و

آگہی سے "لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ اس ایمان ویقین کے بعد خوف وحزن دامن گیر نہیں رہتے۔ حوادث و انقلابات کے متلاطم سمندر میں مومن کی کشتیٔ حیات سکون و وقار کے ساتھ گزرتی ہوئی ساحلِ مقصود پہنچ جاتی ہے۔ نیز معیتِ حق کے علم ویقین کے بعد حق تعالیٰ زندگی کے کاروبار میں ہدایت ورہنمائی بھی فرماتے ہیں مہماتِ امور میں حق تعالیٰ کے ساتھ ہونے کے یقین سے بندۂ مومن کو یہ ایک اطمینان بھی حاصل رہتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے پایا جاتا ہے کہ جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا تعاقب کیا تھا۔ اور دریائے قلزم پر فرعون کی فوج بالکل قریب پہنچ گئی اور حضرتِ موسیٰ کے ساتھی گھبرا کر کہنے لگے۔ ہم تو پھنس گئے۔ پیچھے دشمن ہے اور سامنے دریا۔ حضرت موسیٰؑ اطمینان سے فرماتے ہیں۔

ان معی ربی سیھدین (الشعراء ۴ع)	میرے ساتھ میرا رب ہے وہ ابھی راستہ دکھلائیگا

یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت ورہبری فرمائی جائے گی اور ہم محفوظ رہیں گے۔

اللہ جل شانہ نے اپنی معیت کا جو علم دیا ہے اس کی ایک صورت خاص ہے اور ایک عام ہے تعمیم کا تعلق تمام انسانوں سے ہے۔ اور تخصیص صرف اہلِ حق، اہلِ ایمان سے ہے۔ حق تعالیٰ سب کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ سب کے نگراں ہیں ہر ایک کے افعال واعمال کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہر ایک کے احوال سے وہ جہاں کہیں بھی ہو باخبر ہیں۔ اور اہلِ ایمان کے ساتھ ہونے سے مراد الٰہی یہ ہے کہ اللہ جل شانہ ان کے ناصر و مددگار و محافظ ونگہبان ہیں

ساتویں آیت "فاینما تولوا فثم وجہ اللہ" جب دین صرف روایات و رسوم کا ایک مجموعہ بن کر رہ جاتا ہے تو عقاید میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں از آں جملہ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ عبادت خصوصاً فریضۂ نماز کی ادائی کے لئے جو ایک سمتِ قبلہ مقرر کی جاتی ہے سمت ہی کو حق تعالیٰ کی توجہ اور نزولِ رحمت کا محل قرار دیا گیا اور نماز جو عبد و رب کے فطری تعلق کو قوی اور بہتر سے بہتر کرنے کا ایک الٰہی نسخہ ہے۔ اس کا یہ

مقصد بھلا بیٹھے اور صرف سمت قبلہ کی طرف رخ کر لینے کو بڑی نیکی خیال کر لیا۔ اس باطل ذہنیت کو مٹانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ جل شانہٗ کی توجہ فرمائی اور نزول رحمت کا تعلق کسی سمت مقررہ سے نہیں ہے۔ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں اللہ کو اختیار ہے اپنی عبادت (نماز) کے لئے جو سمت چاہے مقرر کرے۔ تم جس طرف بھی رخ کر کے عبادت کرو گے اللہ جل شانہٗ تمہاری طرف توجہ فرمائیں گے۔

وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ (البقرع ۱۴)	اور مشرق و مغرب اللہ ہی کی ملک ہیں پس تم جس طرف منہ کرو اُدھر اللہ تعالیٰ کا رخ ہے۔

وجہ اللہ سے مراد حق تعالیٰ کی توجہ، وجہ سے توجہ مراد لینا اپنی بات نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں وجہ کے معنی "توجہ" بھی ہیں۔ سورۂ یوسف ملاحظہ ہو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب دیکھا کہ ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسفؑ کو زیادہ چاہتے ہیں تو انہوں نے حضرت یوسفؑ کو گھر سے بے گھر کرنے کی سازش کی تھی۔ اس سلسلہ میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ جب یوسفؑ یہاں نہیں رہیں گے تو تمہارے باپ کی تمام توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ قرآنی الفاظ ملاحظہ ہوں، یخل لکم وجہ ابیکم مولانا شاہ رفیع الدینؒ نے اس آیۂ کریمہ کا یہ ترجمہ کیا ہے۔ "خالی ہو جائے واسطے تمہارے توجہ تمہارے باپ کی" بندہ جب اللہ جل شانہٗ سے عبدیت کے فطری و ابدی تعلق کو قائم کر لیتا ہے اور اپنی زندگی کے اوقات کو ذکر و عبادت میں صرف کرتا رہتا ہے۔ تو اُس کو زندگی کے کاروبار میں اعمال صالحہ کی توفیق اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ہوتی رہتی ہے یہ ہدایت و رہنمائی دراصل اپنے بندۂ مومن پر رحمت اور اُس کی طرف توجہ ہے۔ عمل صالحہ سے پہلے علم صحیح ضروری ہے۔ لہٰذا علم و ہدایتِ الٰہی کا فیضان بندۂ مومن کے حق میں وجہ اللہ ہے۔ جس پر نظر رکھنے سے ذاتِ حق سے گرویدگی و وابستگی بڑھتی جاتی ہے اور بندہ رحمتِ حق کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہوتا جاتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسان کی زندگی کے تمام کاروبار

حق تعالیٰ کی رحمت و توجہ سے انجام پا رہے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اپنے اندر لذت نظر کا صد ہزار سامان رکھتی ہے۔

آٹھویں آیت۔

وفی الارض اٰیٰت للموقنین ۝ وفی انفسکم افلا تبصرون (الذٰریٰت)	اور زمین میں یقین لانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور تمہاری ذات میں کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا؟

اس سورہ میں قیامت کے برحق ہونے اور روزِ جزاء کے واقع ہونے کا ذکر ہے اور اس کے دلائل بیان فرمائے گئے ہیں۔ سورہ کی ابتداء ہی میں ارشاد ہوا ہے۔

انما توعدون لصادق ۝ وان الدین لواقع ۝	تم سے جس (قیامت) کا وعدہ کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے اور جزائے اعمال کا (دن) ضرور واقع ہونے والا ہے۔

اس کے بعد منکرینِ آخرت کا یہ سوال۔

یسئلون ایان یوم الدین۔	پوچھتے ہیں کہ روزِ جزا کب ہوگا؟

نقل فرما کر جزائے تکذیب و انکار "نار" اور جزائے تصدیق و تقویٰ "جنّت" کو بیان فرماتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان کی زندگی کا یہ قدرتی نظام جو جاری و ساری ہے۔ قیامت اور روزِ جزا اس قدرتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے جو اپنے وقتِ مقررہ پر ظاہر ہو کر رہے گا۔ سعی و عمل اور جزائے سعی و عمل لازم و ملزوم ہے جس ربِ قوی و قدیر، حکیم و علیم کی قدرت سے جد و جہد، سعی و عمل کا یہ نظام قائم و جاری ہے۔ وہی ربّ جزائے اعمال کا ایک ابدی عالم بھی پیدا کرنے پر اسی طرح قادر ہے۔ غور کرو زمین میں اس کی کتنی نشانیاں، دلائل موجود ہیں۔ جو آنے والے حیاتِ بعد الموت کے قدرتی نظام پر یقین دلانے کے لئے کافی ہیں۔ اور خود تمہارے انفس میں بھی دلائل موجود ہیں۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حیاتِ بعد الموت کی دلیل میں خشک و مردہ زمین

گے سرسبز و شاداب ہونے کے واقعہ کو پیش کر کے انسان کو توجہ دلائی گئی ہے۔ اور انسان کی پیدائش میں قدرت کی محیر العقول کارفرمائی کو بھی بطور دلیل متعدد مقامات پر بیان فرمایا گیا ہے چنانچہ سورۃ "الحج" میں ایک ہی جگہ انسان کے پیدائش و نشوو نما اور خشک و مردہ زمین کے سرسبز و شاداب ہونے کے قدرتی نظام کو بیان فرما کر انسان کو سمجھایا گیا ہے کہ اسی طرح حق تعالیٰ حیاتِ بعد الموت جو ابدی جزائے اعمال کا نظام ہے اس کو ضرور پیدا کریگا کہ حیاتِ آخرہ ہی حیاتِ دنیا کا آخری انجام ہے۔

یا ایھا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم سے سلسلہ شروع فرما کر انسان کی نشوونما کا پورا نظام بیان فرمایا اور پھر "وتری الارض ھامدۃ" (اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک پڑی ہے) سے دوسرا استدلال شروع کر کے اس آیت پر ختم فرمایا گیا۔

وانہ یحی الموتی وانہ علی کل شیٔ قدیر	اور وہی مردہ کو زندہ کرتا ہے اور وہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے

اسکے بعد ارشاد ہے کہ قیامت اور جزائے اعمال کے لئے مردوں کا زندہ ہونا یقینی ہے۔

وان الساعۃ اٰتیۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور۔	قیامت آنے والی ہے اس میں ذرا شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ قبر والوں کو دوبارہ پیدا کر دیگا۔

جس کی قدرت کی یہ نشانیاں رات دن تجربہ و مشاہدہ میں ہیں کہ خشک و مردہ زمین پھلتی پھولتی ہے۔ ہر قسم کے خوشنما نباتات اُگاتی ہے۔ اور ایک قطرۂ آب سے صاحب اختیار و عقل و تمیز انسان، تمام مخلوق سے اشرف مخلوق پیدا ہوتی ہے۔ نشوونما پاتی اور منازل حیات طے کرتی ہے۔ اس اللہ کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ حیات بعد الموت، ایک ابدی عالم جزائے اعمال کی تخلیق پر قادر نہیں۔ محض کورنگاہی ہے۔ دل و دماغ کا اندھاپن ہے۔ اگر انسان ان آیاتِ الٰہی۔ قدرت کی نشانیوں پر غور کرے۔ تو اس کی فطرت سلیمہ گواہی دے گی کہ عالمِ آخرت ایک حقیقت ہے۔ "افلا تبصرون" سے یہی مراد ہے۔

اسی سورہ میں اس آیت کے بعد قوم لوط کی ہلاکت بیان فرما کر یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ

وترکنا فیھا آیۃ للذین یخافون العذاب الالیم ۰	اور ہم نے اس واقعہ میں ایسے لوگوں کے لیے ایک نشانی رکھی ہے جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں ۔

یعنی اس دنیا میں حق سے سرکشی کرنے والی قوموں کو دفعتہً جو ہلاک کیا گیا ہے ۔ وہ بھی ابدی جزائے اعمال کی ایک آفاقی علامت ، نشانی ہے ۔ اور اسی سورہ میں یہ جو ارشاد ہے ۔

ومن کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون ۰	اور ہم نے ہر چیز دو ' دو قسم (جوڑی) بنایا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو ۔

روز قیامت ، جزائے اعمال کا ابدی عالم جو ایک حقیقت ہے ۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل بیان فرمائی گئی ہے کہ ہم نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے ۔ سردی ، گرمی ، بلندی و پستی ' ذلت و عزت ، روشنی و تاریکی ، شیرینی و تلخی ، ابتدا ، و انتہاء ، آغاز و انجام ' ظاہر و باطن ' اسی طرح دنیا کا جوڑ آخرت ، عارضی دنیائے سعی و عمل کا جوڑ ابدی عالمِ جزا ہے ۔ جزائے اعمال اور غیر فانی و ابدی جزا ، فطرتِ انسانی کا باطنی مطالبہ ہے ۔ حیاتِ ابدی کی یہ بھی ایک انفسی علامت اور اندرونی شہادت ہے ۔ آفاق و انفس کی ان ہی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ۔ تاکہ انسان اپنی بندگی اور اللہ جل شانہٗ کی حکومت و فرماں روائی کو تسلیم کر کے اپنی زندگی سرتاپا بندگی حق بنالے اور شادکام ابدی زندگی کا مستحق ہو جائے اس سورہ کی ابتدا ، قیامت کے ذکر سے ہوئی تھی ۔ قیامت ہی کے ذکر پر سورہ کو ختم فرمایا گیا ۔

فویل للذین کفروا من یومھم الذی یوعدون ۔	ان کافروں کو اس دن بڑی خرابی ہے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے ۔

مطلب یہ کہ قیامت اور ابدی عالم جزا کے برحق ہونے کی ان تمام آفاقی و انفسی علامتوں شہادتوں کو دیکھ کر بھی اگر انسان اس حقیقت کا انکار کر دے اور اپنے کو خدا کی گرفت سے آزاد سمجھے تو نقصان بہرحال اسی کا ہوگا ۔ کیونکہ قدرت کا نظام تو اٹل ہے ۔ قیامت آکر رہیگی ۔ انکار کرنے والوں کے لئے خرابی ہی خرابی ہے ، ابدی خرابی ، ابدی درد و اذیت ' ابدی

سوز و تپش۔

یہ ہے اُن قرآنی آیات، کلامِ الٰہی کا مطلب و مفہوم اور مرادِ الٰہی جن سے مسئلہ وحدت الوجود کا یہ جزو کہ "خالق ہی بصورتِ مخلوق موجود و ظاہر ہے" اور "وجود و صفاتِ حق و خلق ایک ہی ہیں" صدیوں سے ثابت کیا جا رہا ہے۔ آیاتِ قرآنی کی قطع و برید کی یہ سعی پیہم، کاوشِ مسلسل غور فرمائیے کتنے سو برس سے محض لذتِ ذہنی کا سامان بنی ہوئی ہے۔ اور ابتداء و آغاز کی فکر میں غلطاں و پیچاں رکھ کر انسان کو اُس کے انجام سے غافل کرتی جا رہی ہے۔ ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی (اقبالؒ)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اس الحادی سیلاب کو رد کرنے کی ایک سعی مشکور فرمائی تھی اور اس کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا تھا۔ لیکن حضرت ہی کے سلسلۂ رشد و ہدایت کے روشن چراغوں نے خاندانی، روایاتی مسلمات سے متاثر ہو کر حضرت کے قائم کئے ہوئے محاذ کو توڑ ڈالا۔ جس کے بعد قوم کی قوم الا ماشاء اللہ اس سیلاب کی زد میں بہتی جا رہی ہے۔ مجدد صاحبؒ وجود و صفاتِ خلق و حق ایک ہونے کا نہ صرف انکار کرتے ہیں۔ بلکہ مکتوبات میں قرب و احاطہ و معیت کا جہاں بھی ذکر فرماتے ہیں صاف صاف لکھتے ہیں کہ اس کی کیفیت مجہول ہے۔

قال اللہ تبارک و تعالیٰ "واذا سألك عبادی عنی فانی قریب .... هو معهم اینما کانوا" قرب و معیت او تعالیٰ ہمچو ذاتِ او سبحانہٗ بے چون و بے چگونہ است .... ایمان آریم کہ او تعالیٰ قریب و با ما است اما معنی قرب و معیت ندانیم کہ چیست (مکتوب ۳ جلد دوم)

اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں "اور میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کرتے ہیں پس میں قریب ہوں .... اور وہ ان کے ساتھ ہے جہاں وہ ہیں اللہ جل شانہٗ کی قرب و معیت ذات کی طرح بے چون و بے چگونہ ہے۔ ہم ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے قریب اور ہمارے ساتھ ہے مگر معنی قرب و معیت نہیں جانتے کہ کیا ہے۔

دفتر اول کے مکتوب ۲۶۶ میں تحریر فرماتے ہیں کہ کشف و شہود سے جس قرب و معیت کو ہم معلوم کرتے ہیں، اللہ اس سے منزہ ہے۔

او تعالیٰ محیطِ اشیاء بود و قرب و معیّت با ایشاں دارد نہ آں احاطہ و قرب و معیّت کہ درخورِ فہم قاصرِ ما باشد کہ آں شایانِ جنابِ قدس نیست تعالیٰ آنچہ بکشف و شہود معلوم کنند از آں نیز منزہ است

اللہ تعالیٰ اشیاء کو محیط ہے۔ اشیاء کے قریب ہے۔ اشیاء کے ساتھ ہے لیکن وہ احاطہ و قرب و معیت نہیں جو ہماری سمجھ میں آسکے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں ہم اپنے کشف و شہود سے جس احاطت و قرب و معیت کو معلوم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے بھی منزہ ہے۔

مکتوب ۴۶ جلد دوم میں تحریر فرماتے ہیں۔

پس دریں صورت قرب و معیت و احاطہ ثابت بود و کیفیت ہیچ معلوم نہ بود، "ولله المثل الاعلیٰ" ہم چنین است قربے کہ حضرتِ حق را سبحانہٗ با عالم است و ہم چنیں احاطہ و معیّت معلوم الآنیت است و مجہول الکیفیّت ایمان آرم کہ او تعالیٰ قریب و محیط است و با عالم است اما کیفیّت قرب و احاطہ و معیّت او را تعالیٰ ندانیم کہ چیست۔

پس قرب و احاطت و معیت ثابت ہے اور کیفیت کچھ نہیں معلوم اللہ کی شان سب سے اعلیٰ ہے اسی طرح قرب و معیت جو حق تعالیٰ کو عالم سے ہے اس کا ہونا یقینی ہے۔ لیکن کیفیت نامعلوم ہے میں ایمان لاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے قریب اور اس کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ ہے۔ لیکن قرب و احاطت و معیت کو ہم نہیں جانتے کہ کس طرح۔

مکتوب ۲۶۶ دفتر اول میں یہ صراحت بھی کردی کہ صفات و افعال خلق و حق میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ صرف اسمی مناسبت اور لفظی مشارکت ہے۔

باید دانست کہ اللہ تعالیٰ تقدس خود موجود است و اشیاء بایجاد او تعالیٰ

اللہ بزرگ و مقدس خود موجود ہیں۔ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کے موجود کرنے سے موجود و باقی ہیں

موجود اند و او تعالیٰ یگانہ است ہم در ذات وہم در صفات وہم در افعال ہیچکس را در ہیچ امرے با و تعالیٰ فی الحقیقت شرکتے نیست چہ وجود و چہ غیر آں مشارکت اسمی و مناسبتِ لفظی از بحث خارج است صفات و افعال او تعالیٰ در رنگ ذات او سبحانہٗ تعالیٰ بے چون و بے چگونہ اند۔ بصفات و افعال ممکنات ہیچ مناسبت ندارد۔

اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات و افعال میں یکتا ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کی کسی بات میں شرکت نہیں ہے خواہ وجود ہو یا وجود کے علاوہ کوئی اور شئی نام کی شرکت اور لفظی مشابہت بحث سے خارج ہے۔ اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرح بے چون و بے چگون ہیں۔ ممکنات کے افعال و صفات کو اللہ تعالیٰ کے صفات و افعال سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

حضرت نے اسی پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ حضراتِ صوفیہ کے قول "ہمہ اوست" کی تشریح کرتے ہوئے تشبیہ و تنزل و عینیت سے انکار کر دیا ہے اور اس کو کفر و الحاد و زندقہ و ضلالت قرار دیا ہے۔

بدانند کہ از صوفیہ علیہ ہر کہ بوحدتِ وجود قائل اند و اشیاء را عین حق می بینند تعالیٰ و حکم ہمہ اوست می نمایند۔ مرادش آں نیست کہ اشیاء با حق عز و جل متحد اند و تنزیہ تنزل نمودہ و تشبیہ گشتہ و واجب ممکن شدہ بے چون بچون آمدہ کہ ایں ہمہ کفر و الحاد و ضلالت و زندقہ آنجا نہ اتحاد است و نہ عینیت و نہ تنزل است نہ تشبیہ فہو سبحانہٗ (مکتوب ۴۳ دفتر دوم)

جان لو کہ صوفی علیہ میں سے جو حضرات وحدت وجود کے قائل ہیں اور اشیاء کو عین جانتے ہیں اور ہمہ اوست کا حکم لگاتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اشیاء اور حق تعالیٰ ایک ہو گئے ہیں۔ اور تنزیہ نے تنزل کیا ہے اور تشبیہ ہو گئی ہے۔ اور واجب ممکن ہوا ہے۔ بے چون چون میں آ گیا کہ تمام کفر و الحاد و گمراہی بے دینی ہے وہاں نہ اتحاد ہے نہ عینیت و تنزل ہے نہ تشبیہ اللہ تعالیٰ سبحان ہے۔

مکتوب ۲۸۷ دفتر اول میں یہ تحریر کرتے ہوئے۔

عالم را با صانع بے چون ہیچ نسبتے نیست الا آنکہ عالم مخلوق است و دلیل است بر کمالاتِ مخزونہٗ او تعالیٰ و تقدس ماوراء ایں ہر حکمے کہ ہست از جنسِ اتحاد و عینیّت و احاطت و معیّت از سکر وقت و غلبۂ حال است اکابر مستقیم الاحوال کہ از قدح صحو ایشاں را تنزلے ارزانی داشتہ اند ازیں علوم متبری و مستغفر اند اگرچہ بعضے ایشاں را در اثناء راہ ایں علوم حاصل می شود اما بالآخر ازینہا میگذارند و مطابق علوم شریعت علوم لدنی بر ایشاں ایراد میفرمایند۔	عالم کو صانع بے چون سے کوئی تعلق نہیں ہے بجز اس کے کہ عالم مخلوق ہے اور حق تعالیٰ کے کمالاتِ پوشیدہ پر دلیل ہے۔ اس کے علاوہ حکم اتحاد و عینیت و احاطہ و معیت کا جولگایا گیا ہے۔ وہ سکر و غلبۂ حال کا نتیجہ ہے۔ صحیح الحال بزرگ جن کو ہوش کا شربت پلایا گیا ہے۔ ان تمام علوم سے برأت ظاہر کی ہے۔ اور استغفار کرتے رہے ہیں ان میں سے بعض پر یہ حالات طاری ہوئے ہیں آخر میں اس سے بڑھ گئے ہیں۔ اور علوم شریعت کے مطابق ان پر علوم نازل کئے جاتے ہیں۔

موصوف وصفت کے مقید ہونے کی تردید کرتے ہیں۔

وصفت ہمچوں موصوف مقید ہیچ مظہر نہ گردد در تنگنائے صورت معنی چہ گونہ گنجد	موصوف کی طرح صفت بھی کسی مظہر میں مقید نہیں ہوتی در کلبۂ گدایاں سلطان چہ کار دارد

اور مکتوبِ سی و نہم دفتر اول میں یہ فرماتے ہوئے کہ انسانی کمالات اور کمالاتِ وجوبِ حق میں صرف مشارکت اسمی ہے۔ کہتے ہیں:-

دریں مقام زنادقہ و مجسمہ گمان بردہ اند کہ خدائے عزّ و جلّ سلطانہ بصورتِ انسان است	اس مقام پر بے دین اور مجسمہ خیال کرتے ہیں کہ خدائے عز و جل انسان کی صورت میں موجود ہے۔

یعنی حضرت کی تحقیق میں اللہ جلّ شانہٗ کو بصورتِ انسان موجود سمجھنا بے دینی ہے اگر صوفیہ کی ایک جماعت نے نیک نیتی سے روایات و ارشادات پر اعتماد کرکے تحقیق

و غور و فکر کے فطری ملکہ سے کام نہیں لیا تو یہ غیر شعوری لغزش قابلِ تقلید و مثال نہیں ہوسکتی۔ قرآن مجید سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ کسی انسان کی صورت میں اللہ جل شانہٗ کو موجود و جلوہ گر سمجھنا ایک اسرائیلی تصور ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (الخ)	بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی مسیح ابن مریم ہے۔

قرآن مجید میں اس باطل نظریہ کی جو تردید فرمائی گئی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر آیاتِ متشابہات کی تعبیر و تاویل کی جاتی اور کشف و الہام کو اس کی روشنی میں دیکھا جاتا تو یہ اسرائیلی و عجمی و غیر قرآنی تصورات کمال دین کے عقاید کا جزو نہ قرار پاتے۔ آج بھی اگر کوئی اہل علم، صاحبِ عقل و فراست اپنے ادراکات کو ان عجمی رنگینیوں سے پاک و صاف کر کے تحقیق کے میدان میں قدم رکھے تو یقیناً وہ معلوم کرے گا کہ یہ عجمی تصورات ہیں جو غیر شعوری طور سے اسلامی تعلیمات میں داخل ہو گئے ہیں۔ ؎

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج ✽ کہ تار تار ہوئے جامہ ہائے احرامی (اقبالؒ)

ان کو قرآنی و انبیائی تعلیم قرار دینا صرف فقدان تحقیق کا نتیجہ ہے ؎

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی ✽ رہ گئے صوفی و مُلّا کے غلام اے ساقی (اقبالؒ)

مگر افسوس کہ صدیوں سے لا الہ الا اللہ کی وہ نبوی تعلیم رائج نہیں ہے جس سے انسان ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر صرف قرآنی افکار و نظریات کا حامل ہوتا ہے اور ہر کسی کے ارشاد کو بلکہ احادیث کو بھی قرآنی فکر و نظر سے سوچتا اور سمجھتا ہے حضرت مرشدی علیہ الرحمہ کی تعلیمات میں یہی خوبی تھی کہ وہ اپنے تلامذہ کو قرآن کی جانب متوجہ کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ارشادات کو قرآنی معیار پہ جانچو اور کشف و الہام کو قرآن کے تابع رکھو، حضرت نے قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بدعات کو بڑی حد تک دور کیا اگر شیخ کی نظر سے بعض گوشے اوجھل رہ گئے تو وہ حق و صداقت نہیں سمجھے جاسکتے

حدیث احسان ۔

ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہٗ یراک ۔

اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھتا ہے۔

حضرت رفاعی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

"احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا اس کو دیکھ رہا ہے کیونکہ اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے۔ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ہی فرمایا ہے۔ احسان ہم پر لازم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوں جیسا کہ دیکھنے والا اُس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور اللہ سے کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔" (رسالہ الہادی جمادی الاول ۱۳۵۷ھ)

زمانۂ حال کے عارف و عالم مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم نے اپنی کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" میں حدیث احسان کا مفہوم و مطلب یہ تحریر فرمایا ہے:

"حضرت عمرؓ سے اس حدیث میں جس میں جبریل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سوالات کئے ہیں یہ بھی ہے کہ جبریل علیہ السلام نے پوچھا یہ بتلائیے کہ احسان کیا چیز ہے (اس کے معنی لغوی ہیں حسن کردن یعنی عبادت کو اچھی طرح بجالانا یعنی وہ اس طرح کہ وہ ریا اور غفلت سے منزہ ہو حاصل اس کا اخلاص و حضور ہے) آپ نے فرمایا کہ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا کہ اسے دیکھ رہے ہو۔ (یعنی اگر خدا تعالیٰ نظر آتے تو جس طرح عبادت اُس وقت کرتے ایسی کرو اور لامحالہ ایسے وقت میں عبادت اخلاص و حضور کے ساتھ ضرور ہوگی۔ پس اس طرح کی عبادت کرنا چاہئیے اور گو تم اُس کو نہیں دیکھتے مگر ایسی طرح کی عبادت کا داعی موجود ہے۔" (حقیقۃ الطریقہ صہ ۱۵۰)

حضرت بڑے پیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

انت تخاطب الحق عزوجل وتشیر الیہ بقولك "اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ" ھٰذا خطاب لحاضر یا حاضراعندی یا عالما بی قریبا منی یا شاھدا علیّ خاطبوہ فی صلاتکم وغیرھا بھذا الھیئۃ وعلیٰ ھٰذا الصفۃ ولھذا قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم تعبد اللہ کانك تراہ (الخ) (مجلس وعظ ۲۵)

تو اپنے قول "ایاک نعبد وایاک نستعین" میں حق تعالیٰ کو خطاب کرتا ہے اور اس کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ خطاب ہے حاضر کے لئے کہ اے وہ ذات جو قریب حاضر ہے اور اے وہ ذات جو مجھ سے واقف اور میرے قریب ہے اور اے وہ ذات جو مجھ پر مطلع ہے پس اپنی نماز میں اور اس کے علاوہ دوسری حالتوں میں اسی طرح اور اسی نیت سے اس کو خطاب کیا کر اور اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کر کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔

حضراتِ اکابر کے ان ارشادات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث احسان کا جو مطلب عرفان مروجہ میں مشہور ہے۔ " اللہ کی ایسی عبادت کر کہ تو نہیں ہے اللہ ہی تیری صورت میں موجود ہے" یہ مفہوم ان حضرات کے پاس نہیں تھا۔ بلکہ یہ مطلب لیا جاتا تھا کہ ایک اعلیٰ و عظیم جلال و کبریائی والے حاکم علیم و خبیر و حاجت روا کے سامنے جس طرح ایک ادنیٰ ذلیل محتاج غلام رہتا ہے اسی ادراک کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کی عبادت کرنا احسان ہے۔

حدیث قرب نوافل۔

وما تقرب الی عبدی بشئ احب الی مما افترضت علیہ وما یزال عبدی یتقرب الی بالنوافل حتی

اور قرب نہ چاہا میرے بندہ نے کسی چیز سے کہ زیادہ محبوب ہو مجھ کو اس چیز سے جو کہ فرض کی ہیں نے اس پر اور ہمیشہ بندہ میرا قرب طلب کرتا ہے نفلوں کے

احببته فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها (الخ)	ذریعہ مجھے یہاں تک کہ محبوب کرتا ہوں اس کو پھر جب اپنا محبوب کرتا ہوں اس کو تو ہوجاتا ہوں سماعت اسکی کہ اس سے سنتا ہے اور بینائی اس کی کہ دیکھتا ہے اس سے اور ہاتھ اس کا کہ پکڑتا ہے اس سے اور پاؤں اس کا کہ چلتا ہے اس سے۔

اس حدیث کی توضیح وتشریح میں بھی مولینا اشرف علی مرحوم جن کو مجدّد علما کی ایک جماعت مانتی ہے انہوں نے اپنی کتاب "التکشف" میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بجنسہ نقل کر دیا جاتا ہے۔

"جاننا چاہیئے کہ جب بندہ ریاضت ومجاہدہ کرتا ہے تو اس کے صفاتِ رذیلہ ودواعی شہوت وغضب زائل ہوجاتے ہیں اور اس کے نفس میں ایک ملکۂ راسخہ حب مرضیات حق وبغض نامرضیات حق کا پیدا ہوجاتا ہے جس سے بلا تکلّف اعمال حسنہ، افعال محمودہ صادر ہوتے ہیں اور اعمال قبیحہ وافعال ذمیمہ قریب قریب معدوم ہوجاتے ہیں۔ ایسے شخص کی نسبت حدیث میں آیا ہے فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به وبصره الذی یبصر به ویده التی یبطش بها ورجله التی یمشی بها (رواه البخاری عن ابی ہریرة) یعنی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے کان اور آنکھ اور ہاتھ اور پاؤں بن جاتا ہوں۔ اس کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں کہ عقلاً وشرعاً محال ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس کے اعضاء وجوارح سے سب افعال میری مرضی کے موافق سرزد ہوتے ہیں پس گویا میں ہی اس کے اعضاء بن جاتا ہوں۔ پس کلام تشبیہ وتمثیل پر محمول ہے چونکہ مجازاً اس حدیث میں حق تعالیٰ کو آلہ اور عبد کو فاعل کہا گیا ہے

کہ یسمع ویبصر وغیرہ کی اسناد عبد کی طرف ہے صوفیائے کرام نے اسی اطلاق کا اتباع کر کے یہ عنوان مقرر کیا ہے کہ بندہ فاعل اور حق تعالے آلہ بن جاوے اور چونکہ حدیث میں اس مرتبہ کا حصول تکثیر نوافل پہ وارد ہے چنانچہ حدیث مذکور میں عبارتِ مذکورہ سے پہلے یہ جملہ ہے ومایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببتہ (الخ) اور مجاہدہ و ریاضت میں تکثیرِ نوافل لازم ہے خواہ نماز ہو یا روزہ یا کثرتِ مراقبات یا تقلیل شہوات اس لئے صوفیاء اتباعاً للحدیث اس مرتبہ کو قرب نوافل کہتے ہیں اور چونکہ اس میں صفات و افعال رذیلہ کا ازالہ ہوا ہے اس لئے فناء صفات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرا قرب اعلیٰ کا درجہ ہے یعنی عبد کی ہستی ایسی مضمحل ہو جاوے کہ اپنی قدرت و ارادہ کو قدرت و ارادۂ حق کے روبرو ذوقی طور پر کالفانی و کالعدم جاننے لگے۔ اور افعال و اعمال میں بمنزل آلہ محضہ کے ہو جاوے اور حق تعالیٰ کی مؤثریت مستقلہ پیش نظر ہو جاوے اس مرتبہ کو اس عنوان سے تعبیر کرتے ہیں کہ حق فاعل ہو جاوے اور عبد آلہ بن جاوے اور چونکہ یہ اوّل سے اعلیٰ ہے۔ کیونکہ اول میں صرف فنائے رذائل تھا۔ فنائے اختیار نہ تھا اور اس میں فنائے اختیار ہے۔ اس لئے اس سے اعلیٰ ہوا اور حدیث میں تقرب بالفرائض کو تقرب بالنوافل سے اعلیٰ و افضل کہا گیا ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کا سب سے اول جزو یہ ہے وما تقرب الیّ عبدی بشئ احب الیّ مما افترضت علیہ اس لئے موافقۃً للحدیث صوفیہ اس کو قربِ فرائض کہتے ہیں اور چونکہ اس میں سالک کو اپنے صفات ذاتیہ قدرت و اختیار پر بھی نظر نہیں رہتی اس لئے

اس کو فناء ذات سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔"

حضرت بڑے پیر رحمۃ اللہ علیہ مجلس وعظ ۳۹ میں حدیث قرب نوافل کو نقل فرماکر ارشاد فرماتے ہیں۔

یبصر جمیع افعالہ باللہ تعالیٰ ویہ یخرج من حولہ وقوتہ ورویۃ نفسہ وغیرہ تصیر حرکاتہ وحولہ وقوتہ باللہ عزوجل (الخ)

اپنے جملہ افعال کو حق تعالیٰ ہی سے سمجھنے لگتا ہے اور اس کی وجہ سے اپنی طاقت اپنے زور اور غیر کی طرف نظر کرنے سے باہر نکل آتا ہے۔ اس کے حرکات و قوت وزور حق تعالیٰ سے ہوتا ہے۔

ان تمام ارشادات سے واضح ہے کہ قرب مروجہ کا مفہوم ان حضرات کے پاس پایا نہیں جاتا۔ اس حدیث کی توضیح میں وجود وصفات خلق وحق کا ایک ہونا یہ حضرات بھی بیان نہیں فرماتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ بندہ مقرب اپنے تمام حرکات وسکنات کو حق تعالیٰ کی توجہ ورحمت سمجھتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے تمام کاروبار کو اسی علم وادراک سے انجام دیتا ہے اور اس طرح بہرحال حق تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے ہمارے لئے کلام الٰہی کی یہ صداقت ایمان ویقین کا سرچشمہ ہے کہ حق سبحانہٗ تعالےٰ ہمارے قریب ہیں۔ اقرب ہیں۔ ہمارے ساتھ ہیں۔ محیط عالم ہیں۔ اوّل وآخر ہیں ظاہر وباطن ہیں۔ اس ایمان ویقین میں جو لذت وسرور ہے۔ سکون وراحت ہے بندۂ حق کا وہی سرمایۂ زندگی ہے۔ یہی ایمان ویقین مومن کے لئے مایۂ صد عز وناز ہے بندگی میں حسن وخوبی پیدا ہونے کا سنگ بنیاد یہی ہے۔ لیکن قرب واحاطت و معیت کی کیفیت سے انسان کو جہل ہی جہل ہے عجز ہی عجز ہے۔

زمانۂ حال کے محقق مولٰنا اشرف علی صاحب مرحوم فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ کا قرب ومعیت اصل میں بےکیفیت ہے نہ اس کو

قرب ذاتی کہہ سکتے ہیں نہ قرب مکانی، متکلمین اس کو قرب صفاتی کہتے ہیں یعنی قرب علمی۔ لیکن سلف کا مسلک یہی ہے کہ صفات الٰہیہ میں تعین نہیں کرتے بلکہ "ابھموا ما ابھم اللہ" پر عمل کرتے ہیں۔ اور بعض اکابر کے کلام میں جو اس قرب کی تعبیر بعنوان موہم للتقیید آئی ہے مقصود تقیید نہیں ہے۔ بلکہ مقصود تشبیہ بغرض تفہیم ہے۔" (حقیقۃ الطریقہ ص۵۶)

واقعہ یہ ہے کہ قرب و معیّت ذاتی و علمی کے مباحث خیر القرون میں نہیں پائے جاتے۔ خیر القرون کے حضرات نے اپنی فراست ایمانی کو ان لاحاصل مسائل میں ضائع نہیں کیا۔ منطقی موشگافیوں سے دماغ کو خالی کر کے غور کیا جائے تو کسی الجھن اور پیچیدگی میں مبتلا ہوئے بغیر یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ تمام مخلوقات حق تعالیٰ کے معلومات ہیں "ھو بکل شیٔ علیم" قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے۔ عالم و معلوم، خالق و مخلوق میں انفکاک نہیں یعنی مخلوق ہر آن خالق کی توجہ و ارادہ و حکم و قدرت سے قائم ہے اور خالق کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ خالق کا اپنی مخلوقات کو محیط ہونا ان کا قیوم ہونا، ان سے قریب و اقرب ہونا ایک حقیقت ہے۔ بلاکیفیّت و بلا تشبیہ۔ کیفیت و حالت کو دریافت کرنے کی کوشش کرنا "غلو فی الدین" ہے جو شجرِ ممنوعہ ہے۔ "لا تغلوا فی دینکم" (قرآن) کشف و شہود سے جو بات ظاہر و معلوم ہوتی ہے حق سبحانہٗ اُس سے بھی سبحان اور اس سے بھی وراء الوراء ہیں۔ حضرت سید احمد رفاعیؒ فرماتے ہیں۔

"جو شخص اپنے خالق کو پہچاننے کے درپے ہو اگر اس کی معرفت کسی ایسے موجود پر ختم ہو گئی جس تک اُس کا ذہن پہنچ سکتا ہے تو یہ شُبّہ ہے اور اگر خالص عدم تک پہنچ کر مطمئن ہو گیا ہے تو وہ معطل ہے۔ اور اگر ایسے موجود پر دل کو قرار ہو جس کی معرفت سے عاجز ہونے کا دل نے اقرار

کر لیا ہے۔ تو وہ موحد ہے۔

دین اخلاص کا نام ہے جب تم لا الٰہ الا اللہ کہو تو ایسے اخلاص سے کہو کہ جو اغیار سے اور تشبیہ و کیفیت سے اور تحتیت و فوقیت اور قرب و بُعد کے خطرات سے پاک ہو۔

ہمارا پروردگار وہ ہے کہ کوئی عقل اس کو خاص کیفیت سے نہیں سمجھ سکتی اور نہ کوئی نگاہ اس کا ادراک کر سکتی ہے۔" (الہادی ماہ جمادی الاول ۵۵ھ)

منصور حلاج کی صدائے "انا الحق" کی مختلف توضیحات حضرات صوفیاء نے فرمائی ہیں۔ مجدد صاحبؒ نے بھی غلبۂ حال و سکر سے تاویل کی۔ مگر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

"حلاج کے متعلق لوگ نقل کرتے ہیں کہ اُس نے انا الحق کہا تھا اُس نے اپنے وہم کی وجہ سے یہ غلطی کی اگر حق پر ہوتا تو انا الحق نہ کہتا لوگ اس کے کچھ اشعار بھی بیان کرتے ہیں جس سے وحدت کا وہم ہوتا ہے یہ باتیں اور اس قسم کی تمام باتیں باطل ہیں اس کو ہرگز واصل نہ سمجھنا۔" الہادی ماہ رجب ۵۵ھ ص ۳)

علم وحدت کے متعلق فرماتے ہیں۔

"علم وحدت اور علم فلسفہ اور حوان کے مشابہ ہیں ان سے اپنے کانوں کو بہرہ بنا لو کیونکہ یہ علوم تمہارے قدموں کو پھسلا کر جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور تم کو بچائے رکھے"(الہادی ماہ ذیقعدہ ۵۵ھ ص ۶)

اسی رسالے میں علم باطن کے متعلق حضرت کا ایک ارشاد قابل غور و ملاحظہ ہے

"تم ایسا مت کہو جیسا بعض صوفیاء کہتے ہیں کہ ہم اہل باطن ہیں اور وہ اہل ظاہر، یہ علم جس کا نام بعض لوگوں نے علم باطن رکھا ہے اس کی حقیقت دل کی اصلاح ہے .... پس ظاہر و

باطن میں جدائی و تفریق کے قائل نہ ہو تو یہ گمراہی اور بدعت ہے۔"

حضرت کے اس ارشاد سے پتہ چلتا ہے کہ بعض اکابر متقدمین کے نزدیک علم باطن سے مراد اللہ جل شانہ' کے اسماء اور قرب و معیّت کی حقیقت و کیفیت سے مطلع ہونا نہ تھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ شریعت ظاہر کی اصلاح کا نام ہے۔ اور تصوف اصلاح باطن کا نام ہے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے۔ شریعت بروئے قرآن "اصلاح ظاہر و باطن" کی جامع ہے۔ شریعت کو صرف ظاہر کی اصلاح سے متعلق کر کے اصلاح باطن کا نام تصوف رکھنا ایک بڑی لغزش علمی اور کارنامہ تجدید پر ایک بدنما داغ ہے۔

خالق و مخلوق کو بلحاظ وجود و صفات ایک سمجھنا نہ قرآنی علم باطن ہے اور نہ دین و ایمان کا کوئی کمال ہے۔ قرآن مجید نے یہ غور کرنے کی دعوت نہیں دی کہ اللہ کیسے قریب و ساتھ ہیں؟ اللہ جل شانہ' نے مخلوق کو کس طرح پیدا کیا؟ اور نہ اس کا حل دریافت کرنے والوں کے لئے دنیوی و اُخروی انعام مقرر فرمایا اور نہ اس کو بڑے درجہ اور فضیلت کا مقام قرار دیا حیرت ہوتی ہے کہ کیوں صدیوں سے مسلمانوں میں یہ مسئلہ دماغی کاوش اور علمی تحقیق کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا اس جانب انہماک قرآنی دعوت اور قرآنی مقصد کے بالکل خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کا حقیقی مفہوم اور نزول قرآن کا مقصد اجتماعی حیثیت سے مستور ہوتا گیا۔ کلام الٰہی سے وہ مراد الٰہی جس کے حامل خیر القرون کے روشن ستارے تھے، دماغوں سے محو کردی گئی حدیث شریف "والعلم سیقبض ویظھر الفتن" (الدارمی) (ترجمہ: قریب ہے کہ علم اٹھالیا جائیگا اور فتنہ ظاہر ہونگے) میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ جب قرآنی تعلیمات اور نزول قرآن کے مقصد سے بے توجہی کی جائیگی اور غیر قرآنی مسائل میں مسلمان الجھ جائیں گے اور اسی کو کمال دین قرار دیں گے تو قرآنی علم

اٹھا لیا جائیگا۔ یعنی رائج نہ رہے گا۔ الا ما شاء اللہ۔ اسی سے نئے نئے عقیدے پیدا ہوتے ہیں یہی دین کا فتنہ ہے۔ نامناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلہ میں تخلیق انسان اور نزول قرآن کا مقصد قرآنی روشنی میں واضح کر دیا جائے۔

تخلیق انسان اور نزول قرآن کا مقصد

اللہ جل شانہٗ نے انسان کو زمین پر صاحبِ تصرف و با اختیار بنایا

ھو الذی جعلکم خلٰئف الارض (الخ)	اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا۔

اور ہر انسان کو کم و بیش جسمانی، دماغی قوت اور قابلیت عطا فرمائی۔ یعنی کسی میں جسمانی قوت زیادہ رکھی تو اس میں دماغی قابلیت و صلاحیت کم رکھی اور کسی میں دماغی قابلیت و صلاحیت زیادہ رکھی تو جسمانی قوت کم رکھی۔ پھر اس میں بھی تفاوت رکھا۔ بعض کے جسم قوی اور بعض کے کمزور، بعض کو غبی اور بعض کو ذہین بنایا۔ کسی میں حافظہ کی قوت زیادہ رکھی اور کسی کو غور و فکر کا ملکہ زیادہ عطا کیا۔ اور بعض کو جسمانی و دماغی قابلیتوں کا جامع بنایا۔ قابلیت اور صلاحیت کے اس اختلاف اور کمی و بیشی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی انسان کے نظام تمدن کی اساس و بنیاد ہے اور اسباب معیشت و مال و دولت کی تقسیم میں کہیں وسعت اور کہیں تنگی جو نظر آتی ہے اس کا بھی یہی راز ہے اور کمی و بیشی کا مقصد امتحان و آزمائش ہے۔ آیت مذکورہ کے آخری جزو

ورفع بعضکم فوق بعض درجٰتٍ لیبلوکم فی ما اٰتٰکم	اور ایک کا دوسرے پر رتبہ بڑھایا تاکہ تم کو آزمائیں ان چیزوں میں جو تم کو دی ہیں۔

میں اسی طرف اشارہ ہے۔ نیز یہ بھی سہولت بہم پہنچائی گئی کہ مخلوقاتِ ارضی و سماوی کو انسان کے لئے مسخر کر دیا۔

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ الخ (لقمان)	کیا تم غور نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔

اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرنے اور باہم انسانی فطری تعلقات کو خوش گوار رکھنے کے لئے ہر ایک کے فرائض و حقوق کو متعین فرمایا تاکہ انسان ظلم و حق تلفی، اپنی طبعی کمزوریوں، شرورِ نفسی اور شیطانی کید و مکر سے محفوظ رہے اور اپنے حقوق اور ابنائے جنس کے حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے اس چند روزہ عالمِ رنگ و بو سے استفادہ کرے اور امن و سلامتی سے سفرِ حیات طے کرتا ہوا منزلِ مقصود ایک ابدی بامراد زندگی پائے جو فطرتِ انسانی کا حقیقی مطالبہ ہے اور اسی کی طرف انسان کو دعوت دی گئی ہے

واللہ یدعوا الی دار السلام (یونس)	اللہ تعالیٰ دار البقا، کی طرف بلاتے ہیں

ظاہر ہے کہ دار البقاء ابدی سلامتی کا گھر ان ہی انسانوں کو عطا کیا جاتا ہے جو اس دارِ فانی میں اپنے لئے اور تمام بنی آدم کے لئے امن و سلامتی چاہتے ہیں

نزولِ قرآن، دینِ اسلام کا مقصد یہی ہے۔ کہ انسان جو فطرتاً اللہ جلّ شانہ کا بندہ ہے وہ اپنے منصبِ خلافت کو عدل و احسان کی بنیاد پر انجام دے۔ عدل و احسان کے جوہر جو انسانیت کا طرۂ امتیاز ہیں! انسان میں اسوقت تک نمایاں نہیں ہو سکتے جب تک وہ عبد و رب کے فطری و ابدی تعلق کو قائم اور اس کو قوی و مستحکم نہ کر لے۔ چنانچہ خلافت کی قابلیت کو اُجاگر و نمایاں کرنے کے لئے پانچ قرآنی اصول بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جن کو قبول و اختیار کرنے کے بعد عبد و رب کا تعلق جو بالکلیہ فطری و حُبی تعلق ہے قائم و قوی اور قوی تر ہوتا جاتا ہے۔

بنی الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله وان محمداً عبده ورسوله واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة والحج وصوم رمضان۔ (متفق علیہ)	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے گواہی دینی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے حضرت محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اور نماز ادا کرنا، زکوٰۃ دینا اور حج اور رمضان کے روزے۔

بنیاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی قرآنی زندگی یا بالفاظِ دیگر انسانی زندگی کی عمارت

ان بنیادوں کے بغیر تعمیر نہیں پا سکتی۔ انسان کے فطری جذبات کی تربیت کے یہی پانچ اصول ہیں۔ ان کی تعلیم قرآنی انداز پر اگر دی جائے تو اُس کا لازمی اثر یہی ہوتا ہے کہ دنیا کے تکلفات و تعیشات وغیرہ کے بجائے آخرت اور درجاتِ آخرت مطلوب و مقصود ہو جاتے ہیں۔ اور دید و لقاءِ رب کا شوق پیدا ہو کر انسان آخرت کی خیرو ابقیٰ زندگی کا طالب بن جاتا ہے۔ اور زندگی کے تمام کاروبار یعنی فرائض خلافت کو عدل و احسان کی بنیاد پر انجام دینے کی قابلیت اس میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔ وہ صرف مردِ متقی و پارسا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی فکر و نظر کردار و گفتار سے "خلیفۃ اللّٰہ" مردِ مجاہد، بندۂ جاں نثار بنا رہتا ہے اور ایسے ہی بندے مقربانِ بارگاہِ الٰہی بنائے جاتے ہیں۔ مقامِ قرب کے علم و عمل سے وہ سرفراز کئے جاتے ہیں۔ اور اسی مقام کے آداب ان کو سکھائے جاتے ہیں۔ ان کو متقین کے مقام سے ترقی دے کر امام المتقین کا درجہ عطا کیا جاتا ہے۔

الغرض بنیادی تعلیم کے بعد ربِ عزّوجلّ کی آغوشِ رحمت میں بندہ کی تربیت ہوتی رہتی ہے۔ اور عبد و رب کے تعلق میں پختگی و اخلاص اور حسن و خوبی و کمال پیدا ہوتا جاتا ہے، ایسے بندوں کا دامن کسی حالت میں بھی خود غرضی و نفسانیت، حبِ زر و مال، جاہ و شہرت کے ناپاک دھبوں سے داغدار نہیں ہوتا۔ حقوقِ انسانی کا تحفظ و بقاء اور انسان کی فلاح و خیر خواہی کے جذبات سے ان کا قلب معمور رہتا ہے۔ انسانوں سے ان کی دوستی و دشمنی اپنے ذاتی اغراض کے تعلق سے نہیں ہوتی۔ وہ طالبِ حق کے دوست اور مخالفِ حق کے دشمن ہوتے ہیں۔ اور یہ دشمنی بھی عدل و انصاف کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایسے بندوں میں ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف شعبہ ہائے زندگی کے کاروبار کو انجام دینے کی قابلیت اُجاگر کی جاتی ہے۔

بقائے حیات، اکتسابِ معاش، جنسی میلان، افزائشِ نسل کے فطری تقاضوں سے انسان کی ایک مختصر اجتماعی زندگی وجود میں آتی ہے جس کو گھریلو منزلی زندگی کہتے ہیں

جس کے ارکان والدین، زن وشوہر، اولاد اور مخدوم وخادم ہوتے ہیں ان کے آپس کے فطری تعلقات ایک دوسرے پر فطری حقوق بھی عاید کرتے ہیں۔ جب زندگی کا محدود دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے تو ایک بڑی اجتماعی مدنی زندگی کی شکل اختیار کرتا ہے تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، حکومت وسیاست، بین الاقوامی تعلقات معاملات ومعاشیات، اکتسابِ زر واستعمال زر کے مختلف ذرائع یہ تمام انسان کی منزلی ومدنی زندگی کے شعبے ہیں۔ ہر ایک کے حقوق کو عدل واحسان کے ساتھ ادا کئے بغیر اور تمام امور کو عدل واحسان کی اساس پر انجام دیئے بغیر انسان کی زندگی امن وسلامتی کی زندگی نہیں ہوسکتی۔ یہی خلافت کے فرائض ہیں۔ اولاً عبد ورب کے تعلق کو قائم اور باقی رکھنے اور اس کو بہتر سے بہتر بنانے کی دعوت اسی لئے دی گئی ہے کہ منصب خلافت کی قابلیت کما حقہ، مختلف افرادِ انسانی میں ان کی ذاتی صلاحیتوں کے لحاظ سے پیدا کی جائے۔ تاکہ دنیائے انسانیت خون خرابہ، فتنۂ وفساد شر وروآفات سے محفوظ رہے اور افرادِ انسان سکون واطمینان کے ساتھ یہ عارضی زندگی بسر کرکے ابدی بامراد زندگی "عیشۃ راضیۃ" کے مستحق ہوجائیں۔ نزول قرآن کا مقصد یہی ہے کہ ابدی خیر وابقیٰ بامراد زندگی کو انسان مطلوب ومقصود بنالے جس کی طلب ہر انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہے۔ اور قرآنی علم وعمل جس کے حصول کے ذرائع واسباب ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ، آپ کی تعلیمات کا قرآنی انداز، اور حضراتِ صحابۂ کرامؓ کا آپؐ سے تعلیم وتربیت حاصل کرکے اپنی زندگیوں میں انقلاب پیدا کرنا، ان حضرات کا ایثار وقربانی، دنیاوی تکلفات وتعیشات سے بے رغبتی، اخروی زندگی اور وہاں کے درجات وفضائل کی حرص وطلب، ان کے عزائم کی بلندی، ارادوں کی پختگی، ان کے سرفروشانہ ومجاہدانہ کارنامے۔ ان کی فرائض شناسی

وکاروانی وکارفرمائی۔ مصائب ومشکلات ہیں ان کے صبر واستقامت اور راہ حق میں ان کی ثابت قدمی اور ان کے تعلق باللہ کو بنظرِ غائر ملاحظہ کیجئے تو یقیناً آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دعوتِ قرآنی "اُعْبُدُوا اللّٰہ" اور اس کی دعوت کی تکمیل کے لئے قرآنی تعلیمات کا تمام تر مقصد یہی ہے کہ انسان میں خلیفۃ اللہ ہونے کی جو قابلیت ہے وہ اُجاگر ہوجائے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے انسان کا اصلی فریضۂ حیات یہی ہوجائے کہ وہ اوّلاً مرضئ حق کو اپنی ذات اور اپنے متعلقین پر نافذ کرے۔ اور پھر اپنے خاندان، اپنے حلقۂ اثر میں نافذ کرنے کی جدوجہد کرے اور انسانی برادری کو اس کی فراموش کردہ فطری حیثیت "**عبدیت**"، "**بندگیٔ حق**" اور اس کا بھولا ہوا منصب "**خلافت**" اور آخرت کی ابدی بامراد زندگی یاد دلانے کی جدوجہد بلا لحاظ لومۃ لائم اور بلا لحاظ ضررجان ومال کرتا رہے۔ یہی مرضئ حق ہے مرضئ حق کی کامل اتباع ہی سعادت انسانی کا کمال ہے۔ اگرچہ اس راہ میں ع

شرط اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی

حضرات صحابۂ کرام قرآنی دعوت کے اصل مقصد کو لے کر بلادِ عرب سے نکلے عبدیت وخلافت کی قرآنی تعلیمات کو پیش نظر رکھکر انسانی برادری کو درس انسانیت دیتے رہے۔ ایک طرف دنیا ان حقیقی وارثانِ علم کتاب وسنت سے خالی ہوتی گئی۔ دوسری طرف عجمی قومیں جو اپنے باطل تخیلات اور فلسفیانہ غیر صحیح افکار وآبائی اعتقادات پر جمی ہوئی تھیں۔ ان سے مسلمانوں کا میل جول، ربط وضبط قائم ہوا۔ یہ اپنے آبائی اعتقادات کو لے کر داخل اسلام بھی ہوتے تھے۔ حکمت وفلسفہ ومنطق کے بیشتر ماہر ان میں موجود تھے، ان کے ربط وضبط سے حق وباطل کی نزاع کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ شمشیر وسنان کی جنگ کے ساتھ ساتھ افکار کی جنگ بھی شروع ہوگئی اس جنگ کا نزاعی مسئلہ خالقِ کائنات کی معبودیت حقّہ، اور افرادِ مخلوق کی معبودیت باطلہ

نہیں تھا ۔ بلکہ علتِ تخلیق اور سرِ تخلیق یعنی کائنات کو اللہ نے کیوں پیدا کیا اور کس طرح پیدا کیا ۔ یہ دو مسائل موضوع بحث قرار پائے ۔ چونکہ ذات و صفاتِ حق کے بغیر ان مسائل پر گفتگو نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس لئے ذات و صفاتِ حق بھی موضوع بحث ہو گئے کتاب و سنت سے تسلّی حاصل کرنے کے بجائے امور غیبیہ کو کشف کے ذریعہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ، کشفی علوم کی بنا پر آیاتِ متشابہات کی غلط تاویل کا نتیجہ یہ نکلا ۔ کہ ذات و صفاتِ حق مخلوق میں ثابت کئے گئے ۔ اس طرح اللہ جل شانہٗ اور ان کے صفات کے متعلق عجمی افکار کی رنگ آمیزی ہوتی گئی ۔ عرفان مروجہ کی تعلیم ان ہی اندیشہ ہائے عجم کی افسانہ نگاری ہے ۔ معاف فرمائیے اگر یہ عرض کروں کہ تقریباً ایک ہزار برس سے دین اور کمال دین کی سیدھی سادی تعلیم عجمی رنگینیوں سے رنگین ہے اور نسلیں اسی طرح تربیت پاتی چلی آرہی ہیں اور قرآنی تعلیمات کی نورانیت سے محروم ہوتی جا رہی ہیں ۔ تخلیق انسانی اور نزول قرآن کے مقاصد نظروں سے اوجھل ہوتے گئے ۔ اس کے بجائے قرآنی دعوت کی تکمیل عالم ارواح ، عالم مثال کی سیر اور عالم غیب کے انکشافات قرار پائے ۔ اس مقصد کے لئے گُم سُم رہنا ، اور دنیا کے ہنگاموں سے بے تعلق رہنا ناگزیر تھا ۔ جس کے اثر سے دماغی کَل پرزے زنگ آلود ہوتے گئے ۔ امتِ مسلمہ میں دینی جمود و تعطل پیدا ہو گیا حضرت گیسو درازؒ ارشاد فرماتے ہیں ۔

"چند سالکے عارفے ، چند عارفے ہالکے بسیار دین اسلام را زیاں کار آمدند ، چنانکہ فرید عطار ، جلال رومی ، محی الدین ابن عربی ۔"

(مکتوب ششم ۔ مکتوباتِ گیسو درازؒ شائع کردہ مجلس انتظامی روضتین گلبرگہ)

ان غیر صحیح تعلیمات میں شدت و اضافہ بزرگانِ دین کے ان ارشادات سے ہوتا گیا جو غلبۂ شوق و محبت میں صادر ہوتے رہے ، مثلاً خود فراموشی ، خودی کو مٹانا ، من توشدم

تو من شدی، میں نہیں ہوں حق موجود ہے، کشفی علوم و معارف اور صدائے غلبۂ شوق و محبت کی ہم آہنگی نے ایک غیر حقیقی بات کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا اور اعتماد و عقیدت و حسنِ ظن اور انبیائی تعلیم سے نا واقفیت نے اس کو قرآنی و انبیائی تعلیم کا جزو بنا دیا، اسی کا نام قرآنی سلوک رکھ دیا گیا۔ اور ایک اہم اور تمام خوبیوں کا جامع سلوک قرار پایا، اور انائے واحد، وجود واحد کا شغل، یافت و شہود بڑی نیکی قرار پائی نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی دعوت کی روح مفقود ہو گئی۔ مجاہدانہ جذبات فرو ہو گئے۔ عزیمت کا وصف باقی نہیں رہا۔ خلافت جو امانت ہے اور جس کا انسان ہی حامل ہے اس کا حقیقی مفہوم اور اس کے باطل شکن فرائض بھلا دیئے گئے۔ اس امانت "خلافت" کو امانت دہندہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے لئے قرآنی علم و عمل" دینِ حق" کی روشنی عطا کی گئی۔ شقاوت و خیانت یہ ہے کہ امانت کا استعمال مرضیٔ رب "دینِ حق" کے خلاف کیا جائے۔ شقاوت کا انجام سوز و تپش، درد و اذیت کی ابدی زندگی ہے۔

فاما الذین شقوا ففی النار (ھود) | جو لوگ شقی ہیں وہ نار میں رہیں گے۔

اور سعادتِ انسانی یہ ہے کہ امانت "خلافت" یعنی حکومت کے فرائض مرضیٔ رب "دینِ حق" کے مطابق انجام دیئے جائیں۔ جس کا انجام سرور و شادمانی کی ابدی زندگی "الجنۃ" ہے۔

واما الذین سعدوا ففی الجنۃ (ھود) | جو لوگ سعید ہیں وہ جنت میں رہیں گے۔

"الجنۃ" سرور و راحت کی ابدی زندگی، دید و لقائے رب کا یہی مقام ہے۔ یہاں زوال و فنا نہیں قرار و ثبات و دوام ہے۔ اور یہی وہ خیر ہے فطرتاً انسان جس کا طالب ہے۔

بندگیٔ حق، خلافت الٰہیہ، ابدی خیر و ابقیٰ زندگی، فطرتِ انسانی کے یہی کمالات

ہیں ان ہی کمالات پر فائز ہونے کی دعوت انسان کو دی گئی ہے۔ قرآن مجید دراصل فطرتِ انسانی کا تذکرہ ہے۔ یہی خالق فطرت کا ارشاد ہے۔

لقد انزلنا الیکم کتٰبا فیہ ذکرکم افلا تعقلون۔ (الانبیاء)	تحقیق ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا ذکر ہے کیا تم نہیں سمجھتے

"افلا تعقلون" قابل غور ہے انسان کا اپنے آپ کو سمجھنا بہت زیادہ سہل ہے بندہ کا اپنی بندگی کو سمجھنا، بندگی کے اعراض ومقاصد کو سمجھنا ظاہر ہے کہ بالکل آسان ہے اسی لئے فرمایا گیا کہ کیا تم اتنی آسان بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟ اتنی سہل و آسان تعلیم جس میں انسان کو انسانیت سمجھائی جارہی ہے فطری تعلقات اور فطری مطالبات سمجھائے جارہے ہیں۔ اس تعلیم کو غوامض اور اسرار کا ایک مجموعہ بنادینے کا اثر یہ ہوا کہ عالم آخرت جو فطرتِ انسانی کا منتہائے کمال اور انسانی ارتقا کی آخری منزل ہے اس کو بھلادیا گیا اور اس کے متعلق غلط خیالات، غلط باتیں ذہن نشین ہوگئیں۔

انسانی زندگی کا انجام عالم آخرت ہی قرآنی و انبیائی تعلیمات کا ایک اہم بنیادی جزو ہے۔ جس کے ذکر و تفصیل سے قرآن مجید کا کوئی پارہ خالی نہیں۔ انسان کی زندگی کا یہی الٰہی قرآنی نصب العین ہے اس کے بغیر انسان نہ بندۂ حق ہوسکتا ہے اور نہ کمال بندگی کے مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔ قرآن مجید کو غور وفکر سے پڑھیئے۔ اور دراصل قرآن کو غور و تدبر ہی سے پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ افکار و کردار کی تربیت ہی ہوسکتی ہے اور نہ بصیرت قرآنی کی خدا داد دولت حاصل ہوسکتی ہے۔

کتٰب انزلنٰہ الیک مبٰرک لیدبروا اٰیٰتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص)	یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

غرض قرآن کو بغور پڑھنے سے بآسانی یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرات انبیاء ؑ خود بھی اُخروی زندگی کے ابدی مفاد کو ہر وقت پیش نظر رکھتے تھے۔ اور لوگوں کو بھی اس کی طرف ترغیب وتحریص دلاتے تھے۔ جنت اور درجاتِ جنت کو انسان کا مطلوب ومقصود بنانا اور عقوباتِ نار سے ڈرانا، قرآنی تعلیمات وانبیائی تعلیمات کا خاص شعبہ ہے۔ مگر آغاز وابتداء کائنات کی ٹوہ میں مسلمان ایسے منہمک ہوئے کہ انتہا، انجام آخرت کو بھلا بیٹھے۔ اور ادھر سے توجہ ہٹ گئی۔ آج سے نو سو برس پہلے کے مفکرِ اسلام امام غزالیؒ جب قوم کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کو قوم میں آخرت ہی کی تعلیمات کا فقدان نظر آتا ہے۔

فاما علم طریق الاخرۃ ما درج علیہ السلف الصالح مما سماہ اللہ سبحانہ فی کتاب فقہا وحکمۃ وعلما وضیاء ونورا وھدایۃ ورشدا فقد اصبح من بین الخلق مطویا وصار نسیا منسیا۔

راہ آخرت کا علم جس پر سلف صالح گزرے ہیں جس کا اللہ سبحانہ نے کتاب میں فقہ حکمت، علم، روشنی، ہدایت اور رشد نام رکھا ہے۔ مخلوق میں یہ نام مستور ہوگیا۔ اور بالکل بھولی بسری بات ہوگئی۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں آخرت کی طرف بلانے والے کی صحبت کبریت احمر ہے۔

"اگر از علما آخرت پیدا بشود چہ سعادت کہ صحبتِ او کبریتِ احمر است۔"

آخرت کا علم رکھنے والا اگر پیدا ہو جائے تو خوش بختی کا کیا کہنا اس کی صحبت سرخ کیمیا ہے۔

عرفان مروجہ میں آخرت کے تعلق سے بھی جو غلط افکار پیدا ہوگئے ہیں اور اکثر شعرا اپنے کلام میں جس کا اظہار فرماتے رہتے ہیں حضرت مجدد صاحبؒ نے اس پر بھی تنقید فرمائی ہے

جمعے از ایشاں حسن وجمالِ ایں صور را حسنِ حق

صوفیا کی ایک جماعت اشیاء کے حسن وجمال کو

واللہ جل شانہٗ وگرفتاری بایںہا عین
گرفتاری حق می دانند ومشاہدۂ آنہارا
مشاہدہ حق می انگارند۔ بعضے از اینہا گفتہ۔

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است
در حیرتم کہ وعدۂ فردا برائے چیست

تعالی اللہ عما یقولون علوا کبیرا حق سبحانہٗ
را ایں کوتہ نظراں چہ گمان بردہ اند و
حسن وجمال اورا چہ تصور نمودہ ....

....

بایں بے خبری ہمہ وقت بے پردہ حق را
بینندگاں و بوعدۂ رویت اخروی
عجب کنندگان ......

ایں بوالہوساں دریں نشاۃ فانیہ حصول
ایں دولت قاہرہ را تصور نمودہ اند و
بخواب وخیال خود خورسند گشتہ۔

(مکتوب ۲۲ دفتر سوم)

خدائے تعالیٰ کا حسن سمجھی ہے۔ ان مخلوق کی
محبت وتعلق کو خدا سے تعلق سمجھتی ہے مخلوقات
کے مشاہدہ کو حق تعالیٰ کا مشاہدہ جانتی ہے
ان میں بعض شاعروں نے کہا ہے:۔ آج جبکہ تیرا جمال
بے پردہ ظاہر ہے حیرت میں ہوں کہ وعدہ آخرت کس لئے ہے
بہت پاک ہے اللہ تعالیٰ اس سے جو کہتے ہیں حق
سبحانہٗ تعالیٰ کو ان کوتاہ نظروں نے کیا سمجھا ہے
اللہ تعالیٰ کے حسن وجمال کو کیا خیال کر رکھا ہے

....

باوجود اس بے خبری کے ہر وقت جمال حق کو بے پردہ
دیکھنے اور آخرت کی رویت کے وعدوں پر عجب
کرنے والے ......

یہ بوالہوس اس عالم فانی میں اس بڑی دولت
کے حاصل ہونے کا خیال کرتے ہیں اور اپنے
خواب وخیال میں خوش ہیں

قرآنی تعلیمات اور اولیائی سلوک میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآنی، تعلیمات میں استحضار آخرت محمود ہے اور سلوک اولیائی میں نسیان آخرت محمود ہے بلکہ یہ ایک مقولہ بھی مشہور ہو گیا۔

طالب دنیا مخنث، طالب عقبیٰ مؤنث، طالب مولیٰ مذکر

طلب مولا اور طلب آخرت کا فرق بھی ایک عجمی تصور ہے۔ یاد حق میں دنیا و آخرت

کو فراموش کر دینا رہبانیت کی ایک قسم ہے۔ قرآنی تعلیم سے بے توجہی جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ایسے تمام غیر قرآنی تصورات اس بے توجہی کے نتائج و آثار ہیں۔ علمِ حق کی روشنی سے اگر صحیح طور پر دل و دماغ منوّر ہوتے تو عوام و خواص کے دماغ پر غیر قرآنی افکار مسلط نہ ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانوں نے جب کبھی اپنے خالق و رب سے روگردانی کی تو اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ انجام، آخرت کو بھلا دیا گیا یا اُخروی زندگی کے متعلق غلط تصورات میں مبتلا ہوتے گئے۔ قرآن مجید رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہونے کے علاوہ انسانیت کی ایک مکمل و مستند تاریخ بھی ہے۔ اس میں انسانی برادری کے سنوار اور بگاڑ کی حقیقی علّت، عقیدۂ آخرت کے فساد ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ اور آج کی ترقی یافتہ دنیا بھی اسی جہل و نادانی میں مبتلا ہے۔ اور اسی تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی ہوئی ہلاکت و بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ ایک غلط تصوّر تو یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی نہیں ہے۔ زندگی کا یہ نظام عبث و باطل ہے اس کا کوئی آخری انجام اور آخری منزل نہیں ہے۔ انسان ایک شترِ بے مہار ہے جس طرح چاہے من مانے زندگی گزارے اور مر جائے۔ جو لوگ حق سے روگردان ہیں اپنے فطری مطالبات و داعیات و جذبات کو سمجھنے سے جن کے دل و دماغ قاصر ہیں جو اپنی فطرت ہی سے اندھے بنے ہوئے ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں یہ نظامِ کائنات خالقِ کائنات نے خالی از حکمت بنایا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی مقصد و مدعا نہیں ہے حالانکہ نیکی و بدی انسان کے سنوار و بگاڑ کے جو دو قدرتی اسباب ہیں۔ ان کی ابدی جزاء بھی قدرتی اسباب کا قدرتی نتیجہ ہے۔ نیک و بد بلحاظ انجام آخرت برابر نہیں ہو سکتے

ام نجعل الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار (ص ع۳)	کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے برابر کر دیں گے جو دنیا میں فساد کرتے پھرتے ہیں یا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے۔

متعدد مقامات پر قرآن مجید میں یہ ارشاد ہے کہ یہ دنیا جو انسان کی سعی و جد و جہد تصرف و اختیار کی دنیا ہے اس کو بنانے والے نے باطل نہیں، حق بنایا ہے عبث نہیں، حکمت سے بنایا ہے۔

ماخلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض وما بینھما الا بالحق واجل مسمی۔ (الروم ۶ ۱)

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں حکمت سے اور میعاد معین کے لئے پیدا کیا ہے۔

سورۃ "الجاثیہ" کے تیسرے رکوع میں "بالحق" یعنی حکمت کے ساتھ بنانے کی وضاحت فرما دی گئی۔

وخلق السمٰوٰت والارض بالحق ولتجزی کل نفسٍ بما کسبت وھم لا یظلمون

اور اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا اور اس پر ذرا ظلم نہ کیا جائیگا

مطلب یہ ہے انسان بے لگام نہیں چھوڑ دیا گیا کہ وہ امانت "خلافت" کا استعمال من مانے کرتا رہے۔ بلکہ یہ دنیا انسان کے لئے ایک امتحان گاہ ہے کہ وہ کیا طریقۂ کار اختیار کرتا ہے، اپنی قبول کی ہوئی امانت، ذمہ داری کو کس حد تک محسوس کرتا ہے امانت کی ذمہ داری کے متعلق محاسبہ کا تصور ایک فطری تصور ہے۔ اس لئے یہ حقیقت واضح کردی گئی کہ اختیار و تصرف کی ہنگامہ آرائیوں کا باقاعدہ حساب لیا جائیگا۔ اور لازوال و باقی رہنے والے حقیقی حاکم کی عدالت سے جزائے اعمال کے احکام صادر ہونگے اس کے لئے جزائے اعمال کا ایک غیر فانی عالم یقینی و نفس الامری ہے۔ افسوس ہوتا ہے، کہ ابدی جزائے اعمال کی حقیقت ثابت کرنے کے لئے جن آیات مذکورہ بالا سے قرآن مجید میں استدلال فرمایا گیا ہے۔ عرفانِ مروجہ کے عارف ان آیات میں لفظ "بالحق" کی تعبیر سیاق و سباق اور مخاطبین قرآن کے افکار سے قطع نظر کرکے اپنے غلط نظریہ کے تحت

اس طرح کرتے ہیں۔ بالحق کے معنی "بہ وجود حق" گویا آیات کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اپنے وجود سے عالم کو بنایا جق ہی بصورت مخلوق موجود و ظاہر ہے۔ اس کشفی امر کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قرآنی حقیقت ہے۔ غیر شعوری طور سے آیاتِ قرآنی کی قطع وبرید کے ساتھ اپنے مفروضہ مطالب ثابت کرنے کی کوشش صدیوں سے چلی آرہی ہے اور مسلمانوں میں غیر قرآنی تعلیمات رواج پاتی جارہی ہیں۔ غرض گزارش یہ ہے کہ آخرت کی زندگی اور وہاں کے درجات ومراتب کو مقصود ومطلوب بنانا اور اس کو ہر وقت مستحضر رکھنا انبیائی وقرآنی تعلیمات کا جوہر ہے اور اولیائی سلوک میں نسیان آخرت کمال ہے۔ اور طلبِ آخرت نقص ہے۔ اس ابدی سرور وراحت کی زندگی جو ابدی انعام وعطاءِ الٰہی ہے۔ اس کے نسیان کو کمال اور اس کی طلب کو نقص سمجھنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ جس کی طرف اللہ جل شانہٗ دعوت دے رہے ہیں۔

واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہٖ۔ (البقرہ ع ۲۷)	اور اللہ تعالیٰ جنت ومغفرت کی طرف بلاتے ہیں اپنے حکم سے۔

اور نہ صرف اسی زندگی کی طرف بلاتے ہیں بلکہ اس زندگی کے لئے مسابقت کا حکم و ترغیب دیتے ہیں۔

سابقوا الیٰ مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضہا کعرض السماء و الارض۔ (الحدید رکوع ع۳)	اور دوڑو تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین کی وسعت کے برابر ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ جلد از جلد سب سے پہلے اس زندگی کو حاصل کرنیکی تحریص دلاتے ہیں

وسارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃٍ عرضہا السمٰوٰت و الارض۔ (آل عمران ع ۱۳)	جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت کی طرف اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت ایسی ہے جیسی سب آسمانوں اور زمین کی وسعت

آخرت ہی کی زندگی کو خیر و ابقیٰ فرمایا۔ اور اسی بامراد زندگی کیلئے عمل کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔

لمثل ھذا فلیعمل العٰملون (و الصّٰفّٰت)	اسی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیئے۔

اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ حرص کرنے والوں کو اسی زندگی کی حرص کرنی چاہیئے۔

وفی ذٰلک فلیتنافس المتنافسون (التطفیف)	اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنی چاہیئے

آخرت کے درجات و فضیلت کو بیان فرمایا تاکہ بندۂ مومن اسی کو مقصود و مطلوب بنائے رکھے اور اپنے فرائض سے غافل نہ ہو۔

وللاٰخرۃ اکبر درجٰتٍ و اکبر تفضیلا (بنی اسرائیل)	اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے

راحت و مسرت کی ابدی بامراد زندگی، انسانی زندگی، انسانی جذبات و احساسات کی زندگی، درجات و فضائل کی زندگی جس کو حاصل کرنے کا قدرتی ذریعہ بندگی حق اور مدارج بندگی، اتباع رسالت، قرآنی علم و عمل کا غیر فانی ثمرہ و بدل۔ اس کے برخلاف خالق فطرت سے بے نیاز ہو کر جذبات فطرت کو غلط استعمال کرنے کا قدرتی انجام سوز و تپش کی ابدی زندگی، پورا سامانِ زندگی آتشیں، ایک ابدی کرۂ نار، دین حق کی تعلیمات کا یہ قرآنی انداز صدیوں سے رائج نہیں ہے۔ اور یہی زوال امت کا اصلی سبب ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عرفان مروجہ میں قرب و صدیقیت کی جو تعلیم ہے وہ کتاب و سنت سے قطعاً ثابت نہیں ہے۔ بلکہ کتاب و سنت سے مغائر ہے حق تعالیٰ کا قریب و اقرب ہونا، محیط ہونا، ساتھ ہونا، جہاں ایک حقیقت ہے وہاں قرب و معیت کا مجہول الکیفیت ہونا بھی ایک حقیقت ہے۔ دوسرا قرب وہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام اور بندگان خاص کو اللہ جل شانہ سے حاصل ہوتا ہے اور کتاب و سنت میں جس کی واضح تعلیم ہے۔

صمدیت یا قربِ (احسان)

کلمۂ طیبہ کے ظاہر معنی یہ ہیں کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا کوئی حاجت روا مطالباتِ فطرت کو پورا کرنے والا، مالک و حاکم نہیں ہے اور باطن یہ ہے کہ انسان صرف اللہ جل شانہٗ کا محکوم و مملوک اور اُن کے اوامر کا پابند ہے۔ اور جس طرح اپنی ہستی و بقا میں، پرورش و نشوونما میں اللہ جل شانہٗ کے فضل و رحمت کا محتاج ہے۔ اسی طرح عارضی و ابدی زندگی کے متعلق انسان کے جو فطری مطالبات ہیں ان مطالبات کی تکمیل میں بھی اللہ جل شانہٗ کی رحمتِ خاص، دین الٰہی، دین فطرت، دین حق کا محتاج ہے انسان کی یہی فطری حیثیت اس آیۂ کریمہ میں واضح فرمائی گئی ہے۔

یاایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ (الفاطر) اے انسانو! تم صرف اللہ ہی کے محتاج ہو۔

محتاج رحمت کو عارضی و ابدی رحمت خاص کا مستحق بننے کی دعوت دی گئی۔

او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علیٰ رجل منکم ولینذرکم ولتتقوا ولعلکم ترحمون (الاعراف)

اور کیا تم تعجب کرتے ہو کہ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری قوم کے ایک شخص کے ذریعہ نصیحت آئے تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تم پرہیزگار بنو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

ایک دستورِ رحمت، آئین بندگی اس لئے نازل فرمایا کہ محتاج رحمت طالبِ رحمت ہو کر عارضی و ابدی رحمتِ خاص کا مستحق بن جائے۔ آئین بندگی پر عمل کرنا طالبِ رحمت ہونا ہے۔

وھذا کتاب انزلنٰہ مبارک فاتبعوہ واتقوا لعلکم ترحمون۔ (الانعام ۱۹/۶)

اور یہ قرآن بڑی برکت والی کتاب ہے جسکو ہم نے نازل کیا سو اسی کا اتباع کرو اور (اور اتباع نہ کرنے کے نتائج بد سے) ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔

ایمان اور عملِ صالح یعنی بندگی حق پر قائم رہنے کا ابدی ثمرہ یہی ہے کہ بندہ ابدی رحمتِ خاص کا مستحق ہو جاتا ہے اور یہی بندہ کی بامرادی ہے۔

فاما الذین امنوا وعملوا الصلحٰت فیدخلهم ربهم فی رحمته ذٰلک هو الفوز المبین (الجاثیه)	جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کا رب ان کو اپنی رحمت میں داخل کریگا اور یہ کھلی کامیابی ہے۔

اسی لئے حضرات انبیاء علیہم السلام جن کو مقرب و صدیق فرمایا گیا انہیں بھی بندگی حق پر قائم رہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون (الانبیاء)	اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے میری ہی عبادت کرو

انبیاء علیہم السلام کی یہی خصوصیت بیان فرمائی ہے۔

کانوا لنا عٰبدین (الانبیاء)	وہ ہماری ہی عبادت کرتے تھے (ہمارے ہی احکام و ہدایات کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے)

اور ان کے یہ اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔

انهم کانوا یسٰرعون فی الخیرات ویدعوننا رغبا ورهبا وکانوا لنا خٰشعین (الانبیاء)	نیک کاموں میں یہ حضرات جلدی کرتے تھے امید و بیم کے ساتھ ہم کو پکارتے تھے اور ہمارے سامنے تذلل و عاجزی سے رہتے تھے۔

عبادت، والخیرات کا مفہوم قابل غور ہے۔ تذلل، عاجزی، اظہار احتیاج، تضرع و زاری، خوف و ہیبت، اطاعت و انقیاد، تسلیم و رضا، سرفروشی و جاں بازی، گرویدگی و شیفتگی، جہاد فی سبیل اللہ باللسان یا بالسیف۔ خالق و مخلوق کے حقوق کی کما حقہ ادائی یہ سب امور عبادت اور الخیرات کی تعریف میں داخل ہیں۔ عبادت و استعانت' بندگی کے یہی دو اجزاء ہیں۔ اور وہ عمل جو ان دونوں کا جامع ہے الصلوٰۃ ہے۔ قرآن مجید سے ظاہر ہے کہ حضرات انبیا علیہم

اسلام اور اُن کے متبعین کا یہی خصوصی عمل ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے دعا فرماتے ہیں۔

رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ ومن ذریتی

اے رب مجھ کو نماز پر قائم رکھیے اور میری اولاد کو بھی۔

حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر یہی ہدایت فرمائی گئی۔

اقم الصلوٰۃ لذکری

میرے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔

غرض تمام انبیا علیہم السلام کو یہی حکم دیا گیا۔

واوحینا الیھم فعل الخیرات واقام الصلوٰۃ۔

اور وحی کی ہم نے ان کی طرف کہ نیک کام کریں اور نماز قائم رکھیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تاکید فرمائی جا رہی ہے۔

وامر اھلک بالصلوٰۃ واصطبر علیھا

اپنے متعلقین کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیئے اور خود بھی پابندی کیجئے

نیز اس ذاتِ گرامی، آخری نبی پر تمام اہل ایمان سے زاید جو عبادت فرض کی گئی وہ بھی نماز ہی ہے۔

ومن الیل فتھجد بہ نافلۃ لک ٥

اور کسی قدر رات کے حصہ میں نماز پڑھا کیجئے جو صرف آپ کے لئے زاید ہے۔

رات کے اوقات میں اہلِ علم کا جو خاص عمل بیان کیا گیا ہے وہ نماز ہی ہے۔

امن ھو قانت آناء الیل ساجداً وقائماً یحذر الاٰخرۃ ویرجوا رحمۃ ربہ قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لایعلمون (الزمر)

جو شخص اوقات شب میں سجدہ و قیام کر رہا ہے اور آخرت کے (ضرر سے) ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے کہیئے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں۔

یعنی اہل علم وہی ہیں جن کا خصوصی شغل نماز ہے، جو رحمت کے امید وار رہتے ہیں۔
عباد الرحمٰن کی بھی یہی صفت بیان کی گئی ہے۔

والذین یبیتون لربهم سجداً وقیاماً والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جهنم (الفرقان)	جو راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدہ و قیام (نماز) میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے رب سے عذاب جہنم سے محفوظ رکھنے کی دعا مانگتے ہیں۔

حضراتِ صحابہ کرام کے جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں ان میں پہلے نماز ہی کا ذکر ہے۔

تراهم رکعاً وسجداً یبتغون فضلاً من الله ورضواناً (الفتح)	تو ان کو دیکھیگا رکوع کرتے ہوئے سجدہ کرتے ہوئے اللہ کے فضل و رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے

رضوان! رضائے الٰہی کے ظہور کا مقام آخرت ہی ہے۔

وفی الاٰخرة عذاب شدید و مغفرة من الله ورضوان (حدید)	اور آخرت میں عذاب شدید ہے اور خدا کی طرف سے بخشش و رضوان ہے۔

مصلحین کے دو ہی خصوصی اوصاف بیان فرمائے گئے ہیں۔ تمسک بالکتاب اور الصلوٰة۔

والذین یمسکون بالکتب و اقاموا الصلوٰة انا لا نضیع اجر المصلحین (الاعراف)	اور جو لوگ کتاب کے پابند ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں۔ ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

یعنی مصلح وہی ہے جس کی ہر فکر و نظر اور ہر خیال و عقیدہ کا ماخذ صرف کتاب اللہ ہو وہ تمام مسائل کو کتاب اللہ کی روشنی میں حل کرتا ہے۔ کتاب اللہ کی آیات محکمات ہی علم و عمل کا سرچشمہ ہیں۔ علم و حکمت کے انمول موتی وہ اسی چشمہ سے حاصل کرتا ہے۔ اور جس شغل سے اس کو تعلق باللہ، نسبتِ الٰہیہ حاصل ہوتی ہے اور اصلاح کے منازل طے ہوتے ہیں وہ صرف الصلوٰة ہے

ذلت و عاجزی، نیازمندی، خوف و زاری، تسلیم و رضا، اطاعت و سرافگندگی، گرویدگی، شیفتگی، جان نثاری، سرفروشی جو عبدیت کے لوازم اور ایک فقیر، محتاجِ رحمت کے قلبی کیفیات ہیں ان کو پیشِ نظر رکھ کر الصلوٰۃ پر غور کیا جائے تمام کاروبار سے منہ موڑ کر مؤدبانہ قیام و رکوع، قعدہ، سجود، ایک محتاج سراپا محتاج، سراپا قصور۔ سراپا شرم و ندامت کے قلبی کیفیات اور دلی آرزوؤں و تمناؤں کے اظہار کا کتنا مؤثر طریقہ ہے۔ مؤثر کیوں نہ ہو کہ طالب رحمت کو مستحق رحمت بنانے والے "الرحمٰن الرحیم" کا تجویزہ طریقہ ہے۔ رحمانی نسخہ ہے۔ دین و ایمان میں پختگی اور یقین کی قوت اسی نسخہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اصلاح کے تمام منازل یقین ہی سے طے ہوتے ہیں۔ حضرت معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اول صلاح "هٰذه الامة اليقين" امت کی اولیں درستی یقین ہے۔

قرآن مجید میں ائمہ کا جو وصف بیان کیا گیا ہے وہ یقین ہی ہے۔

وکانوا بایٰتنا یوقنون۔ | اور وہ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں۔

یقین کی دولت حاصل ہونے، اصلاح کے تمام مدارج طے ہونے کے لئے جو عمل مخصوص ہے، انبیائی ہے، مسنون ہے وہ نماز ہی ہے۔

حضراتِ انبیاء علیہم السلام، اہل علم، عباد الرحمن، صحابہ کرام اور مصلحین کے اوصاف اور ان کے خصوصی شغل نماز کو مختصراً اس لئے بیان کیا گیا تاکہ قربِ حق و صدیقیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

تقرب الی اللہ، قربِ حق بہت مشہور الفاظ ہیں۔ مگر ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ افسوس ہے کہ وہ عجمی افکار میں گم ہو گیا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں جس قرب و صدیقیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ ہے۔

حدیث قدسی حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے۔

من تقرب منی شبراً تقربت منه ذراعاً ومن تقرب منی ذراعاً تقربت منه باعاً (الحدیث مسلم)

جو مجھ سے ایک بالشت نزدیک ہوتا ہے میں اس سے ایک ذراع (دو بالشت) نزدیک ہوتا ہوں اور جو مجھ سے ایک ہاتھ نزدیک ہوتا ہے میں اس سے دو ہاتھ نزدیک ہوتا ہوں۔

ایک مخلوق دوسری مخلوق سے جس طرح ایک قدم دو قدم قریب ہوتی ہے وہ قرب تو یہاں مراد نہیں اور نہ قرب کا یہ مفہوم مراد لیا جا سکتا ہے کہ "خلق و خالق میں ایک ہی وجود و صفات ہیں۔ اور اسی کا نام قرب و معیت و احاطت حق ہے اور نہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرب و معیت و احاطت کی کیفیت سے مطلع ہو کر اسی ادراک میں رہنا قرب حق ہے۔" کیونکہ اس کشفی تحقیق کا حدیث کے الفاظ (بندے کا ایک بالشت اور ایک ہاتھ اللہ کے قریب ہونے اور اللہ کا بندے سے دو بالشت، دو ہاتھ قریب ہونے) سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بندے کا اللہ سے قریب ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ بندہ محتاج رحمت ہے وہ رحمتِ خاص کا مستحق ہونے کے لیے "الرحمٰن الرحیم" نے جو دستورِ رحمت نازل فرمایا ہے۔ اس کو جس قدر قبول و اختیار کرتا ہے۔ اور بندگی میں حسن و خوبی پیدا کرتا ہے۔ اسی قدر رحمتِ حق کا مستحق ہوتا ہے۔ اور اللہ کا بندہ سے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ طالبِ رحمت پر رحمت نازل فرماتے ہیں۔ رحمتِ خاص کا مستحق بناتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے

واستغفروا ربکم ثم توبوا الیه | اپنے رب سے مغفرت طلب کرو اور اسکی طرف رجوع کرو

میں استغفار و توبہ کی ترغیب یہ پیش کر کے دی جا رہی ہے کہ

ان ربی رحیم ودود۔ | بے شک میرا رب بہت مہربان محبت کرنے والا ہے،

حق تعالیٰ کے قانونِ مغفرت پر عمل کرنا حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا حق تعالیٰ کی خاص رحمت و مودت کا مستحق ہوتا ہے سورۂ توبہ میں ارشاد ہے۔

من یومن باللہ والیوم الاخر و یتخذ ما ینفق قربت عند اللہ و صلوات الرسول الا انھا قربۃ لھم۔

جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور مال خرچ کرتے ہیں تاکہ وہ ان باتوں کو اللہ کے قرب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کا ذریعہ بنائیں یہ چیزیں یقیناً ان کے لئے باعثِ قرب ہیں۔

تقرب کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا۔

سیدخلھم فی رحمتہ ان اللہ غفور رحیم۔ (رکوع ۱۲)

ضرور ان کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں داخل کریں گے اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں

بندہ کے لئے تقرب الی اللہ یہی ہے کہ بندہ رحمتِ خاص کا مستحق بنایا جاتا ہے قرآن کی اتباع کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا مقصد یہی ہے کہ بندے جو محتاج رحمت ہیں وہ اس آئین بندگی کو قبول و اختیار کر کے عارضی و ابدی رحمت خاص کے مستحق ہو جائیں۔ اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ قرآن ہے۔

ما تقرب العباد الی اللہ بمثل ما خرج منہ یعنی القرآن (الحدیث۔ احمد و ترمذی)

اور نہیں حاصل کیا بندے نے نزدیکی اللہ کی طرف مثل اُس چیز کے جو نکلی ہے اس سے یعنی قرآن۔

مقربِ حق وہی ہے جس کو اللہ جل شانہٗ نے اپنی رحمت میں داخل کر لیا اپنا محبوب بنا لیا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مقرب و صدیق فرمایا ہے ان حضرات کے متعلق ارشاد ہے۔

ادخلنھم فی رحمتنا (الانبیاء)

ہم نے ان کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا۔

قرآنی دعوت ہے "اعبدو اللہ" عبادتِ حق، عبد و رب کا ایک فطری حُبی تعلق ہے جس کی ابتداء مالک و حاکم کی ناراضی و عتاب کے خوف اور منعم و رب کی محبت سے ہوتی ہے۔ علم و عمل کی ترقی سے عبادت کا غائبانہ تعلق حضوری ہو جاتا ہے۔ اور خشیت الٰہی و حب الٰہی میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عبادت میں حسن و خوبی

وکمال پیدا ہو کہ بندہ زیادہ سے زیادہ رحمتِ خاص کا مستحق ہو جاتا ہے یہی دین وایمان کی تکمیل اور رحمتِ خصوصی کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہی قربِ حق ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ الخلاق العلیم ہیں اور انسان اللہ کا معلوم ومخلوق ہے یہ ایک حقیقت ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مخلوق اپنے خالق ورب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بندہ ہر وقت آقا کے سامنے ہے غور وفکر ومشق سے جب یہ حقیقت شعور وادراک میں آجاتی ہے۔ تو اللہ جل شانہٗ کا رب ومولا، شاہد وناظر ونگران ہونا کالمشاہدہ ہو جاتا ہے یہی حدیثِ احسان کا مطلب ہے۔ یہاں پہنچ کر بندہ پر اس کا فقر واضح ہو جاتا ہے اور یہ بات کھل جاتی ہے کہ مجھ میں جہل ہی جہل ہے شر ہی شر ہے، اپنی کسی خوبی کو خوبی نہیں سمجھتا اور اپنے میں جو خوبی وخیر پاتا ہے اس کو فیضانِ حق سمجھتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ احساساتِ بندگی، تسلیم ورضا، ذلت ومسکنت، عجز وفقر بدرجہ کمال بیدار رہتے ہیں۔ محبتِ الٰہی، یادِ الٰہی کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ بندگی میں حسن وخوبی پیدا ہو جاتی ہے اور قربِ حق کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ گویا مقربِ حق کی حالت پیشی کے غلام کی سی ہوتی ہے جو ہر وقت انتہائی فقر وذلت، عجز وانکسار کے ادراک میں رہتا ہے۔ اور اٹھنے بیٹھنے میں، ہنسنے بولنے میں، کھانے پینے میں، غرض بندگی کے تمام طریقوں میں حضوری کے پورے آداب ملحوظ رکھتا ہے۔ سہو یا غفلت ہو جاتی ہے تو فوراً استغفار کی توفیق ہوتی ہے۔

توحید کی صحیح تعلیم کے بعد انسان کی زندگی کی تعمیر یعنی حتی الوسع اس کی زندگی سرتاپا بندگی حق بن جانے کا ذریعہ نماز ہی ہے۔ جن ادراکات، احساسات ومطالبات کا اظہار نماز میں کیا جاتا ہے بندۂ مومن کی زندگی میں ان ہی ادراکات ومطالبات کو حتی الامکان بیدار رہنا چاہیئے۔ ورنہ ایمان بے روح ہے۔ صرف وہم وخیال ہے اور نماز صرف رسم ہے۔ اگرچہ نماز میں شروع سے آخر تک بندگی کا ادراک ہے بندگی

کا والہانہ اظہار ہے مگر رب و مولا کے حضور میں کمال عجز و احتیاج و ذلت و غلامی اور رب عزو جل سے کامل گرویدگی و وابستگی کی صورت سجدہ ہے۔ اسی لئے سجدہ کو اللہ جل شانہ نے قرب کا ذریعہ فرمایا۔ "واسجد و اقترب" (سجدہ کر اور قریب ہو) العلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ سے بہت زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ اقرب مایکون العبد من ربہ وھوساجد (مسلم) (زیادہ قرب حاصل ہوتا ہے بندہ کو رب سے سجدہ کی حالت میں) اسی لئے حضرات انبیا علیہم السلام اہل علم، صحابہ کرام، عباد الرحمٰن، مصلحین کا خصوصی شغل جو قرآن سے ثابت ہے وہ الصلوٰۃ ہی ہے۔ حالتِ نماز میں بندہ اپنے رب و مولا کے حضور میں رہتا ہے۔ اس کی ہر حرکت و سکون سے بندگی ظاہر ہوتی ہے۔ بندۂ مقرب کی پوری زندگی کا ظاہراً و باطناً یہی نقشہ ہوتا ہے۔ اسکی زندگی کے لمحات ان ہی ادراکات میں گزرتے ہیں یہی تقرب الی اللہ ہے۔ اسی نمونہ پہ دوسروں کی زندگی کی تعمیر کرنے کی حرص اس کا ایک فطری جذبہ ہوجاتی ہے۔ ایسا بندہ چونکہ اپنے ذاتی جہل و شر پہ مطلع ہوتا ہے اس لئے اپنی کسی نیکی، خوبی (حسنہ) کو شر ذاتی کی آمیزش سے پاک نہیں سمجھتا اور کثرت سے استغفار کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے رب کے سامنے خاشع و نادم رہتا ہے۔ "حسنات الابرار، سیئات المقربین" کا مطلب یہی ہے۔ کہ ابرار اپنے جن اعمال کو صالح و حسن خیال کرتے ہیں۔ اور بدل و اجر کے امیدوار رہتے ہیں۔ مقام قرب کے انسان کی نظر اپنے ان حسنات میں بھی اپنے شر و جہل پہ رہتی ہے۔ سجدے کرتا رہتا ہے اور عرض کرتا رہتا ہے ؎ "ایک سجدہ بھی تیری شان کے قابل نہ ہوا"

جس کی وجہ سے ندامت و خشیتِ الٰہی اس پر غالب رہتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جو مقام صدیقیت کے اعلیٰ انسان ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں کہ نماز میں پڑھنے کی کوئی دعا سکھلایئے۔ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم نے اُن کو جو دعا سکھلائی ہے اس میں صرف سیئات ہی کا ادراک ہے اور اللہ ہی کے فضل سے مغفرت و رحمت کی طلب ہے۔

اللھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفر لی مغفرۃ من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم	الٰہی بے شک میں نے ظلم کیا اپنی جان پر بہت ظلم اور تیرے سوا گناہوں کو کوئی بخشنے والا نہیں ہے تو بخش دے مجھ کو اپنی بخشش خاص سے اور رحم کر مجھ پر تو ہی بخشنے والا مہربان ہے

اس مقام پر حق تعالیٰ کی عطا کی ہوئی وہ تمام ظاہری و باطنی نعمتیں، شعور و ادراک میں رہتی ہیں۔ جن سے انسان کی حیات و بقاء، صلاح، فلاح و خیر کا نظام جاری و ساری ہے۔ اور کوئی نعمت کسی مخلوق کی طرف سے کیوں نہ پہنچے وہ اس کو من اللہ سمجھتا ہے اس طرح ہر نعمت اس کو ذکر الٰہی و شکر الٰہی میں مصروف رکھتی ہے کیونکہ ادراک نعمت سے منعم و معطی کی یاد اور اس کا شکر نقد دم ہے۔ بندہ کے لئے کمال سعادت یہی ہے کہ وہ ہر وقت اپنے رب و مولا ہی کے ذکر و شکر میں رہے۔ یہی بندہ مقرب کے قرآنی مشاغل ہیں۔ ربِ عزوجل کی عطا کی ہوئی ظاہری و باطنی نعمتوں کو ہر وقت مستحضر رکھ کر آدابِ حضوری کے ساتھ رب و مولا ہی کے ذکر و شکر میں رہنا جو غلبۂ حُب الٰہی کا لازمی اثر ہے۔ دین و ایمان کی تکمیل اور توحید کا انتہائی مقام ہے جیسا کہ اس دعائے مسنونہ سے ظاہر ہے۔ اللھم ما اصبح (امسیٰ) بی من نعمۃ او باحدٍ من خلقک فمنک وحدک لا شریک لک فلک الحمد ولک الشکر

اس مقام میں حکم و ہدایت کی بناء پر فرائض عبدیت ادا نہیں ہوتے بلکہ فضل و نعمت کا ادراک اور جذبۂ شکر گزاری اطاعت و بندگی کا محرک ہوتا ہے۔

فاعبد وکن من الشاکرین (القرآن)	پس عبادت کرو اور شکر گزاروں میں رہو۔

مقربِ حق کے قلب پر علمِ الٰہی کا فیضان جاری ہوجاتا ہے اور احتیاجِ علمی کی نسبت اللہ علیم و خبیر سے قائم ہوجاتی ہے۔ قرآنی آیات اور انفس و آفاق کی آیات اللہ میں جو موافقت و مطابقت ہے۔ وہ اس پر واضح ہوجاتی ہے اور قرآنی دعوت یعنی بندگی رب کے جو مصداقات' انفس میں ہیں وہ اس پر واضح کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اللہ جل شانہ کے اسمائے حسنیٰ اور بندہ کے صفاتِ حیات وغیرہ میں جو مغائرت ہے (مطلق و مقید کی مغائرت نہیں) اور جو ربط و نسبت ہے' اس سے وہ مطلع کر دیا جاتا ہے اور شریعت کے اس بنیادی عقیدہ سے متحقق ہوجاتا ہے کہ عبد و رب بلحاظ وجود و صفات ایک نہیں بلکہ بالکل غیر ہیں۔ اور جس طرح دین کی ابتداء میں ایمان بالغیب ہے۔ انتہا میں بھی ایمان بالغیب ہے بندۂ مومن جو ابتدا میں پیامِ رسالت کی تصدیق کر کے صادق ہوتا ہے پیامِ رسالت' قرآنی دعوت کے آفاقی و انفسی مصداقات عبد و رب کے صفات کی حقیقی غیریت اور ان کی باہمی نسبت واضح ہوجانے کے بعد صدیق ہوجاتا ہے۔ لفظ صدیق' صادق ہی کا مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس حقیقت پر اس کو پختہ یقین ہوجاتا ہے کہ بندہ اپنی ہستی و بقاء میں' صفات و افعال میں' ملک و حکومت میں' صلاح و فلاح و خیر میں' اللہ جل شانہ کی توجہ' فضل و رحمت' احکام و ہدایت کا محتاج ہے۔ یہی بصیرتِ محمدیہ ہے۔ اس کے دل میں وہی بات آتی ہے جو وحی کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے الہامات شریعت کے بنیادی و اجمالی عقائد کی تفصیل اور بالکلیہ ان عقائد کے موافق ہوتے ہیں۔ جو آیاتِ محکمات سے متعین ہیں۔ اس کے نزدیک دین کے ابتداء میں جو عقیدہ کفر، شرک ہے قرب و صدیقیت کے مقام پر بھی وہی کفر و شرک ہے۔ اس کی ہر فکر و نظر کا ماخذ صرف خدا و رسول کا ارشاد ہوتا ہے۔ اس مقام کی خاص نعمت و رحمت بصیرتِ قرآنی، جرأت و فراست ایمانی

اور یقین کی دولت ہے۔ جو اس کو دوسروں کے ارشادات، کشفی حقائق اور کشف و کرامت کی خواہش سے بے نیاز کردیتی ہے۔ اس کو یہ ایقان واذعان حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ جل شانہٗ بلاکیفیت و تشبیہ اُس کے قریب واقرب ہیں۔ اس کے ساتھ ہیں۔ رب و مولا کے قریب و ساتھ۔ شاہد و نگران ہونے کا یقین اُس کے ہزاروں دکھ کی ایک دوا اور ہزاروں قلبی امراض کا ایک علاج ہے۔ اپنی ہر حاجت ہر تکلیف کو اپنے رب عز وجل کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ جو اس مقام کی خصوصیت ہے۔ جس کی وجہ سے کوئی حاجت پوری نہ بھی ہو تو اُس کا قلب خوف و حزن سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون (یونس)	بے شک جو اللہ کے دوست ہوتے ہیں ان پر نہ خوف طاری رہتا ہے اور نہ حزن دامنگیر رہتا ہے۔

وہ اپنے رب و مولا کی مرضی و مراد کو اپنی مرضی و مراد بنا لیتا ہے۔ اور اپنی مرضی و مراد سے فنا ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے رب عزّ وجلّ سے اپنی حاجت و تکلیف کو عرض کرتا ہے، دعا کرتا ہے تو اس لئے کہ یہ بھی مرضی رب ہے۔

اس کے مقرّبِ حق، محبوبِ حق۔ داخلِ رحمتِ حق ہونے کی واضح علامت یہ ہے کہ علماً و عملاً، ظاہراً و باطناً وہ متبع رسالت ہوتا ہے۔ اتباعِ رسالت کے خط و خال اس کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثلاً :-

۱۔ کفر و باطل سے اتنی بیزاری پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کی بیخ کنی کے انبیائی عزائم اس کے دل میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں رخصت کا ادنیٰ پہلو بھی اس کے لئے موجب ننگ و عار ہوتا ہے۔ وہ مرضیٔ حق، خدا و رسول کی ہدایت و احکام کو اپنی ذات میں، اپنے گھر میں، اپنے ماحول میں جاری و نافذ کرنے کی جد و جہد کرتا رہتا ہے اور اس کام کو زندگی کا اوّلین

فریضہ سمجھتا ہے۔ اس کو یہی دُھن رہتی ہے کہ اللہ سے بچھڑے ہوئے بندے اللہ سے وابستہ ہو جائیں۔ خدمتِ حق، بقائے حق، اشاعتِ حق اس کی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ ہو جاتا ہے۔ جو حقیقی خدمتِ خلق ہے۔ فطری جذبہ حکمرانی کو رب عزوجل کی مرضی "عدل واحسان" کے تحت انجام دینے کی قابلیت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ جو اس کے بندۂ مقرب، محبوبِ حق ہونے کی خاص علامت ہے۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے یہی فرائض تھے۔ اور یہی خلافت ہے

۲۔ دنیا کے تنعمات و تکلفات و تعیشات اس کے مطلوب و مقصود نہیں رہتے۔ دنیا کی فراغ بالی اور بڑے سے بڑا اقتدار رکھ کر بھی وہ دنیا سے بے رغبت رہتا ہے۔ اس کی زبان پر حکمت کے چشمے جاری کر دیئے جاتے ہیں کفر وشرک اور حق سے روگردانی وحبِ دنیا جیسے امراضِ قلبی کا وہ ماہر بنا دیا جاتا ہے۔ اس میں کامل بیداری، کامل ہوشیاری ہوتی ہے۔ وہ ذرا ذراسی ظلمت کو بھی پہچان لیتا ہے۔ اور زندگی کے کسی گوشہ کو بھی تاریک رکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کی یہی کوشش و تمنا ہوتی ہے کہ وہ اور اس کی اولاد امام المتقین ہو جائے۔

۳۔ آخرت کی خیر و ابقیٰ ابدی زندگی اس کا واحد مقصدِ حیات اور نصب العین ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ خیر و ابقیٰ نے اسی کی دعوت دی ہے اور یہی اس کی مرضی ہے۔ وہی زندگی رضائے الٰہی کے ظہور کا مقام ہے۔ وہ دیدِ لقائے رب کا مشتاق ہوتا ہے۔ اس لئے موت اس کو گراں نہیں رہتی۔

بندۂ مقرب اپنے تمام حرکات و سکنات میں اللہ جل شانہٗ کے فضل و رحمت کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ یہ حقیقت مستحضر ہو جاتی ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے آغوشِ رحمت میں اس کی تربیت کر رہے ہیں۔ وہی اس کو چلا رہے ہیں

کھلا رہے ہیں، پلا رہے ہیں، دِکھا رہے ہیں، سُنا رہے ہیں، چلا رہے ہیں وغیرہ حدیثِ قربِ نوافل کا یہی مطلب ہے۔ اور جس طرح شرعی احکام کی انجام دہی میں حق تعالیٰ کی حاکمیت پر نظر رہتی ہے۔ اسی طرح امورِ تکوینی میں بھی اللہ جل شانہٗ کی آمریت واضح ہو کر اُس کے شعور و ادراک میں رہتی ہے۔ وہ سرتاپا دعا سرتاپا اطاعت ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بندگی کامل ہو جاتی ہے۔ یہی ہے وہ احسان و صدیقیت و قرب جو نہایت ادب و تمیز کا مقام ہے۔ یہاں ذرا سی بے ادبی بے تمیزی، ناراضیِ حق کا موجب ہوتی ہے۔ اگرچہ الٰہی تنبیہات بیدار کرتے رہتے ہیں۔

الغرض بندگیٔ حق، قرآنی دعوت کی تکمیل یہی ہے کہ بندہ ہر وقت ادراک عبدیت میں رہے۔ عبدیت جس قدر شعور و ادراک میں رہیگی۔ اللہ جل شانہٗ کے رب و الٰہ ہونے کا یقین اتنا ہی پختہ ہوگا۔ اور اسی قدر اللہ سے گرویدگی و وابستگی رہیگی۔ عبدیت و خلافت کے فرائض سے غفلت نہ ہوگی۔ عرفانِ مروجہ میں اس قرآنی دعوت کو الٹ دیا گیا۔ اور ادراکِ عبدیت میں رہنے کے بجائے ادراکِ الوہیت "یافت و شہودِ حق" میں رہنے کو قربِ حق قرار دیا گیا۔ حالانکہ بندہ کو حسبِ مفہوم مروجہ نہ اللہ کا ادراک ہو سکتا ہے اور نہ یافت، بندہ کو بندگی کی یافت ہوگی اور بندگی کا ادراک۔ صالحیت و شہادت اور صدیقیت یا قرب و احسان بندگی کے مدارج ہیں۔ صالحیت بندۂ مخلص ہوتا ہے۔ شہادت بندۂ جاں نثار ہوتا ہے۔ بندۂ مخلص ہی کو بندۂ جاں نثار بنا دیا جاتا ہے اور جاں نثار ہی کو قربِ حق کا مقام عطا کیا جاتا ہے۔ دین اور کمالِ دین کی یہی وہ واضح تعلیم ہے۔ جو خدا اور رسول کے ارشادات سے ثابت ہے۔ اللہ جل شانہٗ نے صاف و سیدھا راستہ بتلا دیا ہے۔ اس میں نہ پیچیدگیاں ہیں اور نہ اسرار۔

والله یقول الحق وھو یھدی السبیل۔

(ترجمہ) اللہ حق بات کہتا ہے اور وہ سیدھا راستہ بتلاتا ہے۔

افسوس کہ صدیوں سے مسلمان اس تعلیم سے غافل ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اور مشاہدات و مکاشفات اور ان ہی افکار میں مستغرق رہنے کو قرب حق سمجھے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ کشف و مشاہدات کو مقصود و مطلوب بنا لیتے ہیں اور ان مکاشفات پر وحی کی طرح یقین رکھتے ہیں جن کا ماخذ آیاتِ محکمات خدا و رسول کے واضح ارشادات نہیں ہیں وہ کمالاتِ شریعت سے کماحقہٗ بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔ یہ ظاہرہ و مسلّمات سے ہے کہ خشیتِ الٰہی۔ حُب الٰہی۔ ذکر الٰہی۔ صبر۔ شکر۔ توکل۔ دعا و انابت۔ اطاعت و انقیاد۔ توبہ و استغفار۔ درجات آخرت کی طلب۔ لقاء و دیدرب کا شوق۔ عزیمت، باطل نظام سے بیزاری اعلائے کلمۃ الحق۔ امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ علماً و عملاً جہاد فی سبیل اللہ یہی کمالات، مقرب حق۔ صدیق، عبد کامل، خلیفۃ اللہ کے امتیازی اوصاف ہیں۔ جن کو حاصل کرنے کا قدرتی ذریعہ کتاب و سنت کی خالص تعلیم، رسالت کی کامل اتباع ہے۔ اور حیات دنیا میں عدل و انصاف، امن و سلامتی۔ حیات آخرہ میں حسن و کمال، خیر و خوبی، سرور شادمانی کی ابدی غیر محدود زندگی جس کے قدرتی یقینی ثمرات ہیں۔

بینائی اور نصیحت ہے ان کے لئے جو حسبِ مفہوم قرآنی عبدیت، بندگی حق کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ

تمّت

ناظرین سے!

آج کل کتاب و سنت کی وہ صحیح تعلیمات رواج پذیر نہیں ہیں جو بندہ میں بندۂ حق، خلیفۃ اللہ کی قابلیت پیدا کریں، اِلّا ماشاء اللہ۔

پس جو حضرات اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیں انکا فرض ہے کہ یہ تعلیمات اشاعتِ حق کی نیّت سے دوسرے حضرات تک پہنچائیں۔

ملنے کا پتہ

"ادارۂ الحق" ۔ ڈیوڑھی شہیر یار جنگ
محلہ سلطان شاہی ۔ ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ

حیدر آباد دکن

قیمت عہ
علاوہ محصول ڈاک

تعداد طبع (۱۰۰۰)

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

سنہ ۱۳۶۹ ہجری